قرآن مجید کا تعارف

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

قرآن مجید اس زمین پر اللہ رب العالمین کی سب سے بڑی نعمت اور بندوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ انسانی فلاح ایک لفظ بے معنی بن جاتا ہے اگر انسان قرآن سے نا آشنا ہو، ان حقائق کا اولین بدیہی تقاضا یہ ہے کہ نوع انسانی کا فرد فرد اس کتاب سے واقف ہو، اور جو لوگ اس سے واقف نہ ہوں انہیں اس سے واقف کرا دینے کی کوشش کی جائے۔ بظاہر یہ واقف کرا دینے کی کوشش، صرف اسی بات کا نام معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کو لوگوں کے ہاتھوں میں دے کر ان سے اس کا مطالعہ کرنے کو کہا جائے، اور جب وہ اس کے لیے آمادہ ہو جائیں تو قرآنی مطالب کے سمجھ سکنے میں ان کی مدد کی جائے۔ لیکن آپ نفسیاتی جائزے اور گہری نظر سے کام لیں تو محسوس کریں گے کہ اس عظیم دینی فریضے کی ادائیگی کے لیے اس سے پہلے بھی بہت کچھ کیا جانا چاہیے، کیونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ کوئی انسانی تصنیف نہیں ہے۔ اس لیے اس کے مطالعہ کا مسئلہ بھی کوئی سادہ سا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص نوعیت کا حامل مسئلہ ہے۔ ایک انسانی تصنیف کو محض ایک تصنیف کی حیثیت سے دیکھا اور پڑھا جانا ہے۔ لیکن جس کتاب کو "خدائی تصنیف" ہونے کا دعویٰ ہو، اس کے پڑھنے کے لیے عام ذہنوں میں چند سوالات کا اٹھنا ناگزیر ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا یہ کتاب فی الواقع 'خدائی تصنیف'، اور آسمانی کتاب ہے؟ کیا وہ ٹھیک ٹھیک اسی شکل میں اب تک محفوظ باقی چلی آ رہی ہے۔ جس شکل میں کہ اسے اس کے لانے والے پیغمبر نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا؟ اس کے نزول کی، اس کی ترتیب و تدوین کی اور اس کی حفاظت اور نشر و اشاعت کی تاریخ

کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں بھی جب تک اس طرح کے ضروری سوالوں کا جواب نہ مل جائے، کسی ایسے شخص کے اندر اس کے مطالعہ کی ضرورت اور اہمیت کا صحیح احساس مشکل ہی سے پیدا ہوسکتا ہے جو اس سے کوئی موروثی عقیدت بھی نہ رکھتا ہو۔

یہ کتاب دراصل اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کی تصنیف کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوگ مطالعۂ قرآن کی اہمیت کو محسوس کرلیں اور پھر اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ گویا یہ کتاب مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم حضرات کو سامنے رکھ کر مرتّب کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بعض بحثیں اور تفصیلات ایسی بھی آگئی ہیں جو شاید مسلم قارئین کے لیے کچھ ایسی ضروری نہ ہوں مگر چونکہ ایک غیر مسلم کے لیے وہ قطعی ضروری تھیں، اس لیے ان سے صرفِ نظر کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوتا۔

خیال تھا کہ کتاب میں ایک اور باب "قرآن کی بنیادی تعلیمات" کا بھی ہوگا۔ مگر دو وجہوں سے اس خیال کو ترک کردینا پڑا۔ ایک تو یہ کہ صرف "بنیادی تعلیمات" کے تعارف سے قرآن کی پوری تعلیم کا سمجھ لینا ناممکن تو ہوگا ہی، کچھ بعید نہیں کہ اس کے بارے میں ذہن کچھ غلط تصوّرات کا بھی شکار ہورہیں۔ دوسری یہ کہ 'تعلیماتِ قرآن' کے موضوع پر تفصیل سے لکھنے اور ایک مستقل کتاب مرتب کرنے کا ارادہ ہے، جو ایک طرح سے اس کتاب کی دوسری جلد ہوگی۔ دیکھئے، اللہ تعالیٰ اس ارادے کو جامۂ عمل پہنانے کی توفیق اور فرصت کب عنایت فرماتا ہے۔ ویسے جب تک ایسا نہیں ہو جاتا، پیشِ نظر مقصد کو ایک حد تک راقم کی ایک اور کتاب "اسلام ایک نظر میں" کے مطالعہ سے بھی حاصل کرلیا جاسکتا ہے۔ اس لیے جو حضرات قرآن مجید کے اس 'تعارف' کے بعد یہ بھی جاننا چاہیں کہ اس نے کیا دین پیش کیا ہے، ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ پورا ہو، اور وہ اسے اپنے بندوں کے اندر اپنی کتاب کے مطالعے کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ بنادے۔ آمین۔

صدرالدین۔ یومِ جمعہ۔ ۱۵ ذی الحجہ ۸۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

قرآن مجید کی حیثیت

ذاتِ باری اور اُس کا فیضانِ ہدایت

انسان ایک ایسی بالاتر ہستی کا احساس اور یقین، جو اِس پوری کائنات کی خالق اور مالک ہے، ہمیشہ سے رکھتا چلا آرہا ہے۔ اگر موجودہ زمانے کے اشتراکی مادّہ پرستوں، اور کچھ بے بصیرت فلسفیوں، اور ان کے اندھے پیرووں سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو اس حقیقت کا انکار تاریخ کے صفحات میں شاذونادر ہی مل سکے گا۔ اس عالمگیر احساس اور یقین کی موجودگی میں بالکل ناگزیر تھا کہ انسانی ذہن کے اندر اپنے اس خالق اور مالک کے متعلق کچھ سوالات اٹھیں، وہ سوچے کہ اس بالاتر ہستی سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اور کیا اس کی خالقیت اور آقائی ہم سے کسی خاص طرزِ فکر و عمل کا مطالبہ کرتی ہے؟ اگر کرتی ہے تو کس طرزِ فکر و عمل کا؟ چنانچہ یہ سوالات اُٹھے، اور اس زور و قوت سے اٹھے کہ انسان ان کی طرف سے اپنے کان بند نہ رکھ سکا۔ اور پھر اس کی عقل اور فطرت نے ان کا جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ "تم ایک ذمہ دار مخلوق ہو، کیونکہ تمہیں خالقِ حکیم نے علم و فہم کی ایک مخصوص و ممتاز صفت سے نوازا ہے۔ بُرے اور بھلے کی تمیز عطا فرمائی ہے۔ عمل و اختیار کی آزادی بخشی ہے۔ اس لیے بے جان جمادات اور بے عقل حیوانات سے تمہاری حیثیت بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ان مخصوص صفتوں اور قوتوں کا تمہارے اندر موجود ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ تمہارا

خالق نہیں کسی خاص رویّہ پر کاربند دیکھنا چاہتا ہے۔ تمہیں اپنی مرضی کی راہ چلنے کی اگرچہ پوری پوری آزادی حاصل ہے، لیکن اس آزادی کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ تم بے عقل حیوانوں کی طرح جو جی میں آئے کرتے جاؤ۔ بلکہ یہ ہے کہ صرف وہی کچھ کرو جو تمہارے انسان ہونے کے شایانِ شان ہو، جو ٹھیک اور درست ہو اور جسے خود تمہارے خالق و مالک کی طرف سے ٹھیک اور درست ہونے کی سَند حاصل ہو۔"

عقل و فطرت کے اس جواب نے قدرتی طور پر انسان کو اس بات کا ضرورت مند قرار دے دیا کہ 'درست' اور 'نادرست' دونوں اس کے سامنے لازماً پوری طرح واضح رہیں، زندگی کے پھیلے ہوئے میدان میں ہر قدم پر اسے یہ پورے یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ کس طرف جانا اس کے آقائے حقیقی کے نزدیک صحیح اور پسندیدہ ہے اور کس طرف جانا غلط اور ناپسندیدہ؟ اس صورتِ حال نے اب فطری طور پر یہ مسئلہ پیدا کر دیا کہ انسان کی یہ ضرورت، یہ سب سے اہم اور سب سے واقعی ضرورت پوری کیسے ہو؟ اسے 'درست' اور 'نادرست'، 'صحیح' اور 'غلط'، 'پسندیدہ' اور 'ناپسندیدہ' کا علم ——— واضح اور مکمل علم ——— کہاں سے اور کس سے ملے گا؟ جہاں تک اس کی اپنی قوتوں کا تعلق تھا وہ اس کی یہ ضرورت کسی طرح بھی پوری کرتی نظر نہ آئیں۔ اس معاملے میں نہ تو اس کی جبلّت نے کوئی مدد کی، بلکہ وہ غریب تو اس مسئلے کو سمجھ بھی نہ سکی، نہ اس کے وجدان اور اس کی عقل نے کوئی خاص یاوری کی، اور انہیں بھی کچھ ہی دور چلنے کے بعد اپنی نارسائی کا اعلان کر دینا پڑا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس آسمان کے نیچے کوئی ایسی طاقت نہیں جو اس مسئلے کو حل کر سکے، کوئی ایسا ذریعۂ علم نہیں جس سے اس سوال کا واقعی جواب مل سکے۔ یہ صورتِ واقعی بجائے خود اس امر کا اعتراف تھی کہ اس مسئلے کا حل اور اس سوال کا واقعی جواب آسمان کے نیچے نہیں، بلکہ اس کے 'اوپر' ہی سے مل سکتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کے اس خالق اور پروردگار سے ——— جس نے اس کی مادّی ضرورتوں کی فراہمی کے لیے اتنا بڑا کارخانہ قائم کر رکھا ہے، اور جس نے اس سلسلے کی مطلوبہ قوتوں اور جبلّی ہدایتوں سے اسے پوری طرح نواز رکھا ہے، حتیٰ کہ وہ اسے پیدا ہی اس 'ہدایت' کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کس طرح باقی رکھے اور اس کے لیے اپنی ماں کے سینے سے دودھ

کس طرح چوسے ــــــــــ ایسے حکیم اور دانا اور ایسے رحیم وکریم خالق وپروردگار سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اسے اس کے اس سب سے بڑے مسئلے کا حل نہ عطا کرتا اور اس کی اس اہم ترین ضرورت کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کرلیتا؟ یقیناً یہ اس کی شانِ پروردگاری سے یکسر بعید تھا، اس کی دانائی، اس کی کریمی، اس کی رحمت، اس کا انصاف غرض اس کی ایک ایک صفت اسے ناممکن بتارہی تھی۔ چنانچہ دنیا میں آسمانی ہدایت ناموں اور کتابوں کا وجود جس سے وہ کبھی خالی نہیں رہی، اسی حقیقت کا مظہر ہے۔

قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کا ثبوت

آج آسمانی ہدایت ناموں کے نام سے دنیا میں جو کتابیں موجود ہیں اُن میں سے ایک "قرآن" بھی ہے۔ تاریخی طور پر یہ سب سے بعد کی کتاب، اور سب سے آخری ہدایت نامہ ہے۔ آگے کی سطروں میں اسی کتاب الٰہی کا تفصیلی تعارف پیش نظر ہے۔

لیکن اس تعارف سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ خود اس کتاب کی واقعی حیثیت اور اس کے کتاب الٰہی ہونے کا ثبوت معلوم ہو جائے۔ کیونکہ کسی کتاب کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ وہ آسمانی کتاب ہے، تو اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آجاتا کہ وہ فی الواقع بھی آسمانی کتاب ہے۔ دعوے جہاں صحیح بات کے کیے جلتے ہیں وہاں غلط بات کے بھی کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ مذاہب کی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ جس طرح نبوت اور نزولِ وحی کے جھوٹے مدعی پیدا ہوئے اسی طرح کتنے ہی مذہبی بزرگوں کو خدا کا پیغمبر بلکہ خدا تک بنا دیا گیا اور ان کا کلام کلام الٰہی قرار پا گیا۔ حالانکہ نہ انھوں نے کبھی اپنے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تھا، نہ اپنے کلام کو کلامِ الٰہی قرار دیا تھا۔ ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں قرآن مجید کے متعلق بھی اس سوال کو لازماً اٹھنا ہی چاہیے کہ آخر اس کتاب کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ قرآن کا سب سے بنیادی تعارف بھی یہی ہے کہ اس کا کتاب الٰہی ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت بن کر لوگوں کے سامنے واضح ہو جائے۔

قرآنِ مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کے خاص خاص ثبوت یہ ہیں:۔

پہلا ثبوت:۔ اس امر کا ابتدائی ضروری ثبوت تو یہ ہے کہ یہ قرآن کا اپنا صریح بیان ہے، صرف اس کے ماننے والوں کا دعویٰ نہیں ہے۔ اس نے اس امر کی بار بار صراحت کی ہے کہ میں کسی انسان کا کلام نہیں، بلکہ اللہ رب العٰلمین کا کلام ہوں جسے اس نے اپنے خاص فرشتے، جبرئیلؑ کے ذریعے اپنے بندے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچایا تھا۔ مثلاً:۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ سورۂ شعراء۔ ۱۹۲/۱۹۵	اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ (قرآن) پروردگارِ عالم کا نازل فرمایا ہوا ہے اسے امانت دار فرشتے نے (اے محمدؐ) تمہارے دل پر اتارا ہے تاکہ (تم لوگوں کو عذابِ آخرت) سے خبردار کرنے والے بنو، صاف ستھری عربی زبان میں۔

بلاشبہ قرآن کا اپنے بارے میں یہ بیان دینا بھی کہ میں اللہ کی کتاب ہوں، ایک دعویٰ ہی ہے، اور اس سے اس کا کتابِ الٰہی ہونا ثابت نہیں ہو جاتا، لیکن اس کے باوجود اس بیان کی حیثیت، جیسا کہ عرض کیا گیا، "ابتدائی ضروری ثبوت" کی بھی ہے کیونکہ اس کے بغیر اثبات و استدلال کی گفتگو آگے چل ہی نہیں سکتی، بلکہ یوں کہیے کہ شروع بھی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ اس لیے کہ یہی بیان وہ چیز ہے جو قرآن مجید کے بارے میں کتابِ الٰہی ہونے کے دعوے کو باضابطہ اور قابلِ توجہ بناتی ہے، اور اسی کی بنیاد پر یہ دعویٰ غور و بحث کا حقدار قرار پاتا ہے، جس کے دو بڑے اہم اور اصولی وجوہ ہیں:۔

ایکؔ تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کتاب کوئی عام معنوں کی کتاب اور تصنیف نہیں ہوتی، کہ اس کی باتوں سے اتفاق یا اختلاف کرنے میں لوگ آزاد ہوں، حتّٰی کہ سرے سے اس کے پڑھنے کے بھی مکلّف نہ ہوں، بلکہ فی الواقع سلطانِ کائنات کی طرف سے نافذ ہونے والا فرمان ہوتی ہے، اور اس مطالبے کے ساتھ آتی ہے کہ اس کے آگے

گردنیں جھکادی جائیں، اس کی بلاچون وچرا پیروی کی جائے اور لازماً کی جائے، ورنہ انسان کے لیے ہلاکت ہی ہلاکت ہوگی۔ ظاہر ہے، جس کتاب کی غایت، اہمیت اور حیثیت یہ ہو، بالکل ناگزیر ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے اپنی اس حیثیت کی صاف وصریح لفظوں میں منادی کردے۔ اس کے بغیر وہ اصولاً اس بات کی ہرگز حقدار نہ ہوگی کہ لوگ اُسے لازماً پڑھیں، اس کی حیثیت کو ضرور ہی زیرِ بحث لائیں، اس کے بارے میں اس امر کی بہرحال تحقیق کریں کہ وہ کتاب الٰہی ہے یا نہیں، اور پھر اسے اپنے آقائے حقیقی کا فرمان اور آسمانی ہدایت نامہ تسلیم کرکے اس کی پیروی کریں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومتیں اپنے قوانین گزٹ میں شائع کرکے اس بات کا باضابطہ اعلان کرتی ہیں کہ باشندگانِ ملک کے لیے اس وقت یہ قوانین بنائے گئے ہیں اور جب تک وہ ایسا نہیں کرلیتیں، رعایا پر ان قوانین کے بارے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوا کرتی۔

دوسرے یہ کہ کسی کتاب کے کتاب الٰہی ہونے کا دعویٰ فی الواقع اس کا اپنا (یا اس کے لانے والے پیغمبر کا) دعویٰ ہوتا ہے، نہ کہ اس کے پیروؤں کا۔ اس کے پیرو تو اِس دعوے کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کا یہ کہنا کہ یہ کتاب کتابِ الٰہی ہے، اس دعوے کی صرف ایک شہادت ہوسکتی ہے، نہ کہ اصل دعویٰ، اور کسی شہادت، کا سوال پیدا اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ کوئی باضابطہ دعویٰ سامنے آچکا ہو۔ اس کے بغیر شہادت بالکل بے محل، بے ضرورت اور ناقابل التفات ہوگی۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ شہادت ایک ایسے دعوے کی دی جارہی ہو، جس کا فی الواقع وجود ہی نہ ہو، اور ایک ایسے شخص کو خدا کا پیغمبر، اور ایک ایسی کتاب کو اللہ کی کتاب ہونے کی گواہی دی جارہی ہو جس نے خود اس طرح کا کوئی دعویٰ ہرگز نہ کیا ہو، تاریخ ادیان کے صفحات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس امکان کو عقیدتوں کے غلو نے بارہا واقعیت کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جو اس دعوے کی صراحت کرتا ہو کہ میں آسمانی کتاب ہوں، مگر لوگوں نے خود اپنی طرف سے یہ دعوےٰ مہیا کرلیا، اور ایک انسانی کلام کو وحی اور فرمودۂ الٰہی بنا کر رکھ دیا۔

ان وجوہ سے ضروری ہے کہ قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کی بحث کو اس بات پر موقوف

رکھا جائے کہ وہ اپنے بارے میں خود اپنی زبان سے اس بات کا صریح دعویٰ کرتا ہے یا نہیں اگر کرتا ہے تو اس بحث کو اعتناء کے قابل اور فکر و تحقیق کا حقدار سمجھا جائے، ورنہ نہیں ۔ اس لیے قرآن کا اپنا یہ صریح بیان کہ میں اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا ہوں، بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کی حیثیت بھی ایک طرح کے ثبوت کی ہو جاتی ہے۔

دوسرا ثبوت :- قرآن کی اور اس کے لانے والے پیغمبر کی آمد کا ذکر و اعلان پچھلے آسمانی صحیفوں (تورات اور انجیل) میں بشارت کے طور پر پہلے ہی سے ہو چکا تھا، اور یہ ٹھیک ان ہی صفتوں اور علامتوں کے ساتھ دنیا میں نمودار ہوا جو ان صحیفوں میں اس کی بتائی گئی تھیں چنانچہ اُس نے اپنے مخاطبین کے سامنے اس بشارت کو بار بار ایک کھلی ہوئی حجّت کے طور پر پیش بھی کیا۔ مثلاً :-

مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرَىٰ وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ الخ (سورۂ یوسف، ۱۱۱)

یہ قرآن کوئی گھڑا ہوا (اور انسانی) کلام نہیں ہے، بلکہ (اللہ کا کلام ہے اور) اپنے سامنے کی موجود پچھلی آسمانی کتابوں کی پیشینگوئیوں کے عین مطابق ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ الخ (اعراف، ۱۵۷)

جو اس اُمّی رسولؐ اور نبی کی پیروی اختیار کریں، جس کا تذکرہ وہ اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پا رہے ہیں۔

تورات اور انجیل میں یہ بشارت یا پیشین گوئی کہاں کہاں اور کن لفظوں میں تھی ؟ اس سوال کا صحیح اور مکمل جواب اسی وقت مل سکتا تھا جب یہ کتابیں آج بھی اپنی حقیقی شکل میں موجود ہوتیں، اور ان میں کوئی کمی بیشی اور تبدیلی نہ ہوئی ہوتی۔ مگر تاریخی طور پر یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ کتابیں بعینہٖ انہی الفاظ و عبارات میں اب محفوظ اور باقی نہیں رہ گئی ہیں جن میں وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں، بلکہ ان کے علمبرداروں نے ان میں کافی ردّ و بدل کر ڈالا ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ وہ پیشین گوئیاں اور بشارتیں بھی اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہ سکتی تھیں جو قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کتابوں کے

اندر نازل ہوئی تھیں خصوصاً اس حقیقت کے پیش نظر تو یہ بات بالکل ہی غیر متوقع ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والوں کو قرآن اور رسالتِ محمدی کی صداقت کا ثابت ہونا کسی حال میں بھی گوارا نہ تھا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اُن کے اندر آج بھی ایسے فقرے کثرت سے موجود ہیں جن میں ایک مخصوص نوعیت کی کتاب اور ایک مخصوص شان کے رسول کی آمد کی واضح پیشین گوئیاں ملتی ہیں اور ان پیشین گوئیوں کا مصداق اگر کوئی قرار پا سکتا ہے تو وہ قرآن کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے چند فقرے دیکھیے:۔

(۱) "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر اُن کے لیے آتشین شریعت تھی۔"

(استثنا، باب ۳۳)

(۲) "میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کوئی.... میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔" (استثنا، باب ۱۸۔ آیات ۱۸، ۱۹)

(۳) "یسوع نے ان سے کہا، کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا، اور ہماری نظر میں عجیب ہے، اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی۔ اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔"

(متی کی انجیل باب ۲۱۔ آیات ۴۲ تا ۴۴)

(۴) "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا، اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔"

(یوحنا کی انجیل باب ۱۶۔ آیات ۱۲، ۱۳)

(۵) "دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا، اور میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند

جس کے تم طالب ہو ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہوگا، ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزو مند ہو آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے"۔

(ملاکی، باب ۳۔ آیت ۱)

(۶) "اس وقت سے یسوع نے منادی کرنا اور یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ کرو، کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے"۔ (متی باب ۴۔ آیت ۱۷)

(۷) "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے۔ اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار (وکیل یا شفیع) بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے"۔ (یوحنا، باب ۱۴، آیات ۱۶-۱۷)

لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا، اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا"۔

(آیت ۲۶)

اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب ہو جائے تو تم یقین کرو۔ اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں"۔ (آیت ۲۹ - ۳۰)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیجدوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ (باب ۱۶۔ آیات ۷، ۸)

(۸) "دیکھو پرانی باتیں پوری ہو گئیں، اور میں نئی باتیں بتاتا ہوں اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں، اے سمندر پر گذرنے والو، اور اس میں بسنے والو! اے جزیرو اور ان کے باشندو! خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ۔ زمین پر سر تا سر اس کی ستائش کرو، بیابان اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں، سلع کے بسنے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں۔ وہ

خداوند کا جلال ظاہر کریں اور جزیروں میں اس کی ثنا خوانی کریں۔ خداوند بہادر کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی طرح اپنی غیرت دکھائے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا، میں بہت مدت سے چپ رہا۔ میں پہاڑوں اور ٹیلوں کو ویران کروں گا، اور اندھوں کو اس راہ سے جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا، میں ان کو ان راستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔ میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی اور اونچی نیچی جگہوں کو ہموار کروں گا۔ میں ان سے یہ سلوک کروں گا اور ان کو ترک نہ کروں گا۔ جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں، تم ہمارے معبود ہو، وہ پیچھے ہٹیں گے اور بہت شرمندہ ہوں گے۔ یسعیاہ۔ باب ۴۲۔ آیات ۹-۱۷)

توراۃ اور انجیل کے ان فقروں اور پیشین گوئیوں پر۔ یہاں کوئی تفصیلی بحث تو نہیں کی جا سکتی، البتہ ان کے خاص خاص ٹکڑوں کے متعلق ضروری وضاحت درج ذیل ہے:۔

"کوہ فاران"، مکّہ میں واقع ہے۔ "آتشین شریعت"، کے معنی جہاد و قتال اور غلبہ و اقتدار والی شریعت ہے۔ "اُن ہی کے بھائیوں" (یعنی بنی اسرائیل کے بھائیوں) سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ "تیری مانند" کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی تیری ہی (یعنی حضرت موسیٰؑ ہی کی) طرح مستقل کتاب اور شریعت لانے والا رسول ہوگا"۔ "جس پتھر کو معماروں نے ردّ کیا"، یہ اشارہ بھی بنی اسماعیل کی طرف ہے کیونکہ جہاں بنی اسرائیل ایک مدّت دراز تک امامت کے منصب پر فائز اور صاحب کتاب و رسالت رہے۔ اس دوران یہ لوگ اس شرف سے یکسر محروم رہے تھے "وہی کونے کا پتھر ہوگیا"، یعنی آخر میں وہی خانوادہ اس منصب امامت کا حامل بنایا گیا، اور آخری کتاب جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی اسی میں نازل ہوئی۔ "خدا کی بادشاہی" سے مراد مکمل اور معیاری حکومت الٰہیہ ہے۔ "پھل لائے گی"، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کا پورا پورا نفاذ کردے گی اور اپنی برکتیں ظہور میں لائے گی۔ "مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے" مطلب یہ ہے کہ تم احکامِ خداوندی کی مزید امانت کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس لیے میرے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تکمیل بھی نہیں فرما رہا ہے۔ "مددگار اپنی ہیکل میں آموجود ہوگا"، یعنی اس رسول موعود

کی آمد اس طرح اور ایسی جگہ اور ایسے لوگوں کے اندر ہوگی جس سے تمہیں تعجب سا ہو جائے گا۔ "عہد کا رسول" میں 'عہد' سے مراد 'ختنہ' کا عہد ہے جو ابراہیم اور ان کی نسل سے لیا گیا تھا (جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۱۷ - آیت ۱۰ - میں صراحت کی گئی ہے) اس لیے 'عہد کے رسول' کے معنی ہوں گے ایسا رسول جو ختنے کی ابراہیمی سُنّت کو عام اور عالمگیر بنا دے گا۔ اور یہ رسم اس کی شریعت کی اور اس کی اُمت کی ایک معروف و ممتاز علامت ہوگی۔ "مددگار" جس اصل عبرانی لفظ کا ترجمہ ہے اس کا عربی انجیل میں ترجمہ 'فارقلیط' کیا گیا ہے۔ اور 'فارقلیط' کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو لفظ 'محمدؐ' یا 'احمدؐ' کے ہیں۔ "ابد تک تمہارے ساتھ رہے" کا مطلب بالکل کھلا ہوا ہے، اور وہ یہ کہ اُس کی لائی ہوئی کتاب و شریعت توراۃ و انجیل کی طرح ایک محدود زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگی۔ "دنیا کا سردار" یعنی سارے جہاں اور پوری نوعِ انسانی کے لیے اللہ کا رسول، نہ کہ صرف کسی خاص قوم یا ملک کے لیے۔ 'مجھ میں اُس کا کچھ نہیں'، یعنی میرے (عیسیٰ کے) مقابلہ میں وہ بہت اونچا اور بلند پایہ رسول ہوگا۔ "خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ"، مطلب یہ کہ پوری دنیا اور اس کے سارے بحر و بر کے لیے ایک نئی کتاب اور ایک نئی شریعت آنے والی ہے۔ "قیدار" بنی اسماعیل میں ایک مشہور شخص گزرا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی کی نسل میں پیدا ہوئے۔ "سلع" مدینے کی نزدیک کی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ "میں بہت مدّت سے چُپ رہا" یعنی زمانۂ دراز تک وحی و رسالت کا سلسلہ موقوف رہا،

اُمید ہے کہ یہ مختصر سی توضیحات بھی ان فقروں کا حقیقی منشاء معلوم کر لینے کی کوشش میں کافی مددگار ثابت ہوں گی، جس کے بعد ہر راست باز اور حق پسند انسان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جائے گی کہ توراۃ اور انجیل کی ان پیشینگوئیوں میں جس کتاب اور جس نبی کی آمد کی بشارتیں دی گئی ہیں وہ قطعی طور پر قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، چنانچہ جب قرآن نازل ہوا تو یہودی اور نصرانی علماء کو یہ سمجھ لینے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے ہم منتظر تھے اور جس کے بارے میں ہمیں پیہم بشارتیں دی جاتی رہی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ

نے فرمایا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ ط
(سورۃ انعام۔ ۱۱۵)

جن لوگوں کو ہم نے اپنی کتاب (توراۃ) دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یقیناً یہ (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل فرمایا ہوا ہے۔

اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ٥
(شعراء۔ ۱۹۷)

یہ کہ بنی اسرائیل کے علماء اس (قرآن) کو جانتے پہچانتے ہیں۔

چنانچہ ان میں جو صحیح معنوں میں 'علماء' تھے اور جن کے دلوں میں خدا کے خوف اور حق کی محبت پر گروہی عصبیت غالب نہیں ہوسکی تھی وہ بے تأمل اس کتاب الٰہی سے آچمٹے، اور جب اُن کے سامنے قرآن کی دعوت پیش ہوئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ان کی اپنی ہی متاعِ مطلوب تھی۔ جو انھیں عطا کی جا رہی ہے، قرآن مجید کے اندر اس تاریخی حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں کیا گیا ہے:۔

فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ :۔
(عنکبوت، ۴۷)

پس وہ لوگ جنہیں ہم نے (صحیح معنوں میں) کتاب دی تھی اس (قرآن)، پر ایمان لا رہے ہیں۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ط یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ٥
(سورہ مائدہ۔ ۸۳)

اور یہ نیک باطن (نصاریٰ) جب رسولِ خدا پر نازل ہونے والے کلام (قرآن) کو سنتے ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ اُن کی آنکھیں معرفتِ حق سے اشکبار ہو جاتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ خدایا! ہم اس پر ایمان لائے، پس تو ہمیں (بھی اس کے) گواہوں میں لکھ لے۔

تاریخ ان حق پسندوں کی جو فہرست پیش کرتی ہے، وہ کافی لمبی ہے، ان میں حبشہ کے فرمانروا نجاشی، ان کے بھتیجے ذومخمر، فلسطین کے رومی گورنر اور اسقف ابن ناطور، نجران کے

عیسائی حاکم کے بھائی کرز بن علقمہ، قبیلہ بنی طے کے سردار عدی بن حاتم، تورات کے مشہور علماء کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے لوگ بھی شامل ہیں، ان بے شمار یہودیوں اور نصرانیوں کا قرآن پر ایمان لانا بجائے خود اس امر کی ایک ناطق دلیل ہے کہ وہی توراۃ اور انجیل میں مذکور پیشین گوئیوں کا مصداق تھا، کیونکہ یہ حضرات پہلے ہی سے صاحبِ کتاب و شریعت تھے۔ قریش وغیرہ کی طرح بے کتاب، نہ تھے کہ اپنی اس احتیاج اور محرومی کو دور کرنے کے لیے قرآن کو خواہ مخواہ بھی کتاب الٰہی تسلیم کر لیتے۔ اس لیے اگر انہوں نے تورات اور انجیل کی جگہ اب قرآن کی پیروی اختیار کر لی اور موسوی یا مسیحی ملّت سے اپنے قدیم جذباتی رشتے کو کاٹ کر امتِ محمدیہؐ کے دائرے میں شامل ہو گئے تو نفسیاتی اور عقلی دونوں حیثیتوں سے ایسا اسی لیے ممکن ہو سکا کہ ایک طرف انہوں نے اپنے صحیفوں میں مذکور پیشین گوئیوں کو دیکھا، دوسری طرف قرآن اور صاحبِ قرآن پر نظر ڈالی اور ان کے دل پکار اٹھے کہ جس چیز کی ہمیں خبر دی گئی تھی بلا شک وہ ظہور میں آچکی ہے۔ اور پھر ان کی حق پسندی نے انہیں اسے اختیار کر لینے پر مجبور کر دیا۔

تیسرا ثبوت:۔ قرآن مجید کے اندر کوئی اختلاف اور تضاد نہیں پایا جاتا، اس کی یہ صفت اس کی صداقت کی ایک واضح دلیل ہے جیسا کہ اس نے خود بھی فرمایا ہے:۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ (النساء۔)	اگر یہ قرآن اللہ کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

اور یہ اس لیے کہ یہ کتاب تیئیس ۲۳ برس کی لمبی مدت میں اور سخت متضاد حالات کے اندر پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اگر یہ انسانی تصنیف ہوتی تو عادۃً اور عملاً یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ اس کے مضامین، اس کے اصول و افکار اور اس کی تعلیمات تضاد اور اختلاف سے یکسر پاک ہوتیں انسانی تصنیف تو بالعموم ایسی حالت میں بھی ان عیوب سے پاک نہیں ہوتی جب کہ اسے ایک سے حالات میں صرف چند مہینوں کے اندر اور مسلسل طور پر لکھا گیا ہو۔ پھر جس کتاب کی تکمیل میں سینکڑوں مہینے اور ہزاروں دن گزرے ہوں۔ اور جسے حالات کے غیر معمولی اُتار چڑھاؤ

سے سابقہ پیش آیا ہو، اس کے اندر تضاد اور اختلاف کا موجود نہ ہونا کیونکر ممکن ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے اندر یہ "ناممکن" صراحتہً ممکن بن کر ایک امر واقعی کی شکل میں موجود ہے، اور اس کے پھیلے ہوئے مضامین اور مفصل احکام و ہدایات میں غایت درجہ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کے معنیٰ اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اس کا "مصنّف" کوئی انسانی ہستی نہیں، بلکہ وہ علیم و خبیر اور قادر مطلق ہستی ہے جس کے علم میں اختلاف کبھی راہ نہیں پا سکتا، اور جس کی فرمائی ہوئی باتوں میں زمانے کا بڑے سے بڑا فصل بھی کوئی تضاد نہیں پیدا کر سکتا۔

چوتھا ثبوت:۔ قرآن نے اپنے مشن کے سلسلے میں متعدد پیشین گوئیاں کیں اور بالعموم ایسے حالات میں کیں جب کہ ان کے پورے ہونے کے ظاہری اسباب و قرائن ناپید تھے، مگر دنیا نے ان میں سے ایک ایک کو پورا ہوتے دیکھا۔ اور کوئی پیشین گوئی بھی غلط ثابت نہ ہوئی۔ مثلاً:۔

(الف) اس نے ۶ سنہ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ:۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ط

(سورۂ فتح - ۲۷)

تم انشاء اللہ مسجد حرام (کعبہ) میں ضرور داخل ہوگے، پورے امن و اطمینان کے ساتھ، اپنے سروں کو منڈائے اور بالوں کو ترشوائے، اس حال میں کہ تمہیں کسی کا خوف نہ ہوگا۔

ان لفظوں کے جزم و یقین کو دیکھیے۔ پھر اس حقیقت کو یاد کیجیے کہ یہ الفاظ اس موقع پر فرمائے گئے تھے جب مسلمانوں کو کفار مکہ سے بہت کچھ دب کر معاہدۂ صلح کرنا پڑا تھا، جب وہ اپنے مرکز دین (کعبہ) کے دروازوں پر پہنچکر زبردستی روک دیے گئے تھے۔ اور انہیں اس کی زیارت کیے بغیر پوری دل شکستگی کے عالم میں واپس چلا آنا پڑا تھا۔ یقیناً یہ حالات ہرگز ایسے نہ تھے کہ ان کے اندر مسلمانوں کو مکے میں فاتحانہ داخلے کی توقع دلائی جا سکتی۔ مگر قرآن نے صرف توقع ہی نہیں دلائی بلکہ پورے جزم و یقین کے ساتھ فرمایا کہ ایسا ضرور

ہوکر رہے گا، حتیٰ کہ اس داخلے کی تصویر کشی تک اس نے کر دی، اور پھر دو سال بعد ہی ایسا ہو بھی گیا۔ مسلمان ٹھیک اسی شان کے ساتھ مکے میں داخل ہو گئے جس کی مذکورہ بالا لفظوں میں خبر دی گئی تھی۔

(ب) اس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ :۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ

(سورۂ نور، ۵۵)

تم میں سے جو لوگ سچے ایمان والے اور نیکو کار ہیں اُن سے اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلافت کا اقتدار عطا فرما کر رہے گا جس طرح کہ اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو عطا فرمایا تھا اور ان کے اس دین کو یقیناً مضبوطی سے جما دے گا۔ جسے اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، اور ان کی حالتِ خوف کو حالتِ امن سے لازماً بدل دے گا۔

یہ بات مسلمانوں سے جس وقت اور جن حالات میں فرمائی گئی تھی ان کی وضاحت خود ان ہی لفظوں کے اندر موجود ہے۔ یعنی یہ کہ یہ حالات سرتاسر خوف و دہشت کے حالات تھے، دین کے عدم استحکام کے حالات تھے، غلبہ و اقتدار سے محرومی کے حالات تھے۔ پھر چند برسوں کے اندر ہی اندر یہ حالات جس طرح پلٹ کر رہ گئے، اور عرب کی زمین و آسمان بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے، اس کی تفصیل سے پوری دنیا واقف ہے جو آیت مذکورہ کے الفاظ کو واقعات کی شکل اختیار کرتے ہوئے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔

(ج) اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مدینے کی پُر آشوب اور جنگی خطرات سے بھری ہوئی فضا میں بھی اعلان کیا تھا کہ :۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ

اللہ تمہیں سارے لوگوں سے محفوظ

النَّاسِ - (مائدہ - ۶۷) رکھے گا۔

اور مکے کی دہشت مظلومیت اور بے چارگی کے دوران بھی اطمینان دلایا تھا کہ:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا - (طور، ۴۸) تم اپنے رب کے لیے جمے رہو کیونکہ تم ہماری (یعنی اللہ کی) نگاہوں میں ہو

اس سلسلے میں یہ بتانے کی مطلق ضرورت نہیں کہ مکہ کے بالادست مشرکوں مدینے کے بدباطن منافقوں اور سازشی یہودیوں اور پورے عرب کے کثیر التعداد اسلام دشمنوں کی تمام تر خواہشوں اور کوششوں کے باوجود قرآن کی یہ اطمینان دہانی ایک روشن حقیقت ثابت ہوئی، اور رسولِ خدا کی ذات کے خلاف کوئی تدبیر، کوئی سازش اور کوئی سعی و جہد بالکل کامیاب نہ ہوسکی حالانکہ نبوت کے تیئیس سالہ دور میں آپ بارہا ایسے خطرناک حالات سے گزرے جن میں حیاتِ مبارکہ کا باقی رہ جانا کسی طرح متوقع نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ مکہ کے دورِ ناتوانی میں ایک خاندان بنی ہاشم کے سوا قریش کے باقی سارے قبیلوں نے آپؐ کو قتل کرڈالنے کے لیے متحدہ اقدام کیا۔ ایسا بھی ہوا کہ ہجرت کے دوران، تعاقب کرنے والے اس غار کے دہانے پر جاکھڑے ہوئے جس کے اندر آپ چھپے بیٹھے تھے، ایسا بھی ہوا کہ اس تعاقب کے دوران اس مسلح دشمن نے آپ کو راستے میں دیکھ لیا لیکن آپ کو پکڑ لینے کی کوشش میں اس کے گھوڑے نے بار بار ٹھوکر کھائی اور اس کے قدم زمین میں دھنس کر رہ گئے، ایسا بھی ہوا کہ یہودیوں نے ایک دعوت کے بہانے آپؐ کو ایک خاص راستے سے لیجانا چاہا کہ اوپر سے ایک بھاری پتھر گراکر آپؐ کو شہید کردیں، ایسا بھی ہوا کہ جنگل میں آپ کو سوتے پاکر ایک دشمنِ اسلام نے آپؐ کی تلوار اپنے قبضہ میں کرلی اور یقین کے لہجہ میں بولا "بتا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچاسکتا ہے؟" پھر ایسا بھی ہوا کہ اُحد اور حُنین کے معرکوں میں کئی کئی ہزار اعدائے دین کے درمیان آپ تقریباً تنہا رہ گئے...... غرض ایسے کتنے ہی مواقع پیش آئے جن میں انسانی قیاس اور تجربے کی نظروں میں آپ کا زندہ بچ رہنا انتہائی غیر متوقع تھا، لیکن ہر موقع پر یہی دیکھا گیا کہ "فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا" کا تقاضا اپنی جگہ سے نہ ٹل سکا، اور "وَاللّٰهُ

يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کی بات اپنی جگہ جوں کی توں قائم رہی۔

(د) اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بارے میں اعلان کیا تھا کہ:-

وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ○ (حجر ۹) یقیناً ہم اس (قرآن) کو محفوظ رکھیں گے۔

یہ اعلان یا پیشین گوئی جس طرح ایک حقیقت اور واقعہ ثابت ہوتی چلی آرہی ہے کوئی دیانت دار منکرِ اسلام بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن جن لفظوں میں اور جس شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش ہوا تھا، آج بھی وہ بعینہٖ ان ہی لفظوں میں اور ٹھیک اسی شکل میں پوری طرح محفوظ پایا جا رہا ہے جب کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کے بارے میں اس کامل محفوظیت کا دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہو، اس کا ایک حقیقت ثابت ہونا تو دور کی بات ہے۔ لیکن قرآن نے اپنے متعلق جو خبر دی تھی کہ میں ہمیشہ محفوظ رہوں گا، اب تک کی تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ یہ خبر ذرّہ برابر غلط نہ تھی۔

(ہ) اس نے ایرانی مجوسیوں کے ہاتھوں رومی عیسائیوں کی شکست فاش کے موقع پر یہ اطلاع دی تھی کہ:-

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى	رومی مغلوب ہو گئے سرزمین عرب
الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ	کے قرب میں لیکن وہ اپنی اس مغلوبیت
غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ	کے بعد چند ہی برسوں میں، پھر غالب
بِضْعِ سِنِيْنَ ط (روم ۲ تا ۴)	ہو رہیں گے۔

سات برس گزرتے گزرتے یہ اہل کتاب رومی آتش پرست ایرانیوں پر فی الواقع غالب آگئے، اور اس طرح قرآنِ کریم کی دی ہوئی یہ اطلاع تاریخ کا ایک سچا واقعہ بن گئی

(و) اس نے یہودیوں کے متعلق ان کی حق دشمنی کی پاداش بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى	وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) ان پر قیامت
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ	تک ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا

سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ جو اُن کو بدترین مصائب میں ڈالیں گے۔
(سورۂ اعراف، ۱۶۷)

یہ قوم ایک طویل مدت سے جس طرح رہ رہ کر ذلیل وخوار اور تباہ وبرباد ہوتی چلی آرہی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ کبھی آشوریوں نے انہیں پامال کیا، کبھی بابل کے حکمراں بخت نصر نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھدی۔ کبھی رومی شہنشاہ ٹیٹس نے اُنہیں تہس نہس کر ڈالا، کبھی اہل اسلام کے ہاتھوں انہیں قتل اور جلاوطنی اور غلامی کا عذاب اٹھانا پڑا، کبھی ہٹلر ان پر قہر بن کر ٹوٹا اب آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے، اسے تو اپنے وقت پر ہی دیکھا جا سکے گا۔ اس وقت تو زمانہ حال ہی تک کی تاریخ زیر بحث لائی جا سکتی ہے، اور اس کے بارے میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہ ہمہ گیر رسوائیوں اور بربادیوں کے عبرتناک واقعات سے بھری پڑی ہے۔

ان چند اہم اور نمایاں قسم کی پیشنگوئیوں کے علاوہ قرآن میں اور پیشین گوئیاں بھی موجود ہیں، اور انہی کی طرح وہ سب بھی ایک ایک کر کے پوری ہو چکی ہیں۔ یہ صورتِ واقعہ اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ یہ پیشین گوئیاں کرنے والا غیب کا قطعی علم رکھتا تھا۔ ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ یوں سب کی سب سچ نکلتیں، اور ان میں سے کوئی ایک بھی غلط ثابت نہ ہوتی۔ آخر دنیا میں نجومی اور کاہن بھی پیشین گوئیاں کرتے ہی رہتے ہیں، مگر کسی ایک بھی نجومی یا کاہن کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کی ساری کی ساری پیشین گوئیاں یوں صحیح نکلتی رہی ہوں، اس کے بخلاف ہوتا یہ ہے کہ اگر ان کی ایک پیشین گوئی صحیح نکل آئی تو چار غلط ثابت ہو گئیں۔ جس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے، اور وہ یہ کہ یہ پیشین گوئیاں لازمی طور پر صرف قیاس اور اندازے پر مبنی ہوتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ مستقبل کے بارے میں ہوشیار سے ہوشیار انسان کے اندازے بھی ہمیشہ صحیح ثابت نہیں ہو سکتے، اب اگر قرآنی پیشین گوئیوں کا حال اس عام اور ہمہ گیر صورتِ حال سے مختلف رہا اور وہ بلاتفریق سب کی سب سچ ہی ثابت ہوئیں تو یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ان کی بنیاد انسانی قیاس اور اندازے پر ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ غیب کے واضح اور قطعی علم پر تھی،

یعنی وہ کسی انسان کی طرف سے نہ تھیں، بلکہ اس خدا کی طرف سے تھیں جس کے سوا غیب کا واضح اور قطعی علم کسی اور کو حاصل ہی نہیں، دوسرے لفظوں میں یہ پیشین گوئیاں جس کتاب نے کی ہیں وہ ہرگز کوئی انسانی تصنیف نہیں بلکہ یقیناً خدائی کلام ہے۔

پانچواں ثبوت :- قرآن مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کا پانچواں ثبوت یہ ہے کہ اس نے پچھلے انبیاء کی سرگزشتوں کو اس طرح بیان فرمایا ہے جس طرح کوئی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے۔ یہ سرگذشتیں اکثر ایسی ہیں جن کی صحیح تفصیل سے اس سے پہلے نہ آپؐ کو کوئی واقفیت تھی نہ آپ کے وطن اور قوم میں اُن کا کوئی چرچا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں بعض قصّوں کو بیان کر کے آخر میں فرمایا بھی ہے کہ اس پورے واقعے کو آج سے پہلے نہ تم جانتے تھے نہ تمہاری قوم جانتی تھی۔ (" مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ") (ہود، ۴۹) پھر یہ انبیاء جن کے قصّے قرآن نے اپنے دعوتی مصالح کے تحت جابجا بیان کیے ہیں، زیادہ تر بنی اسرائیل کے انبیاء تھے بنی اسمٰعیل یعنی قوم عرب سے تعلق رکھنے والے نہ تھے، کہ اس قومی اور نسلی تعلق کی بناء پر اس قوم کو ان سے فطری دلچسپی ہوتی، اور اپنی تاریخ اور روایات میں وہ انھیں جگہ دیتی۔ اس لیے قدرتی طور بھی آپ کو اور عام بنی اسمٰعیل کو ان کے حالات سے کوئی خاص واقفیت نہیں ہوسکتی تھی۔ اِس صورتِ حال کی موجودگی میں قرآن نے ان انبیاء کی سرگزشتیں بیان فرمائیں، اور اِس طرح بیان فرمائیں کہ خود تورات کو، جو اُن ہی انبیاء کے صحیفوں کا مجموعہ ہے، ان میں سے کسی کی تردید کی جرأت نہ ہوسکی، اور اگر اس نے کہیں یہ جرأت کی بھی تو وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ بلکہ اس کے ذریعہ اس نے دراصل خود اپنی ہی تردید کرلی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تورات کے بیانات قرآنی بیانات سے جہاں کہیں مختلف ہیں، وہاں کا یہ اختلاف حقیقی اور اصل تورات کا اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ اُن تحریفات کا اختلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی توراۃ میں اُس کے پیروؤں کے ہاتھوں راہ پاچکی ہیں۔ چنانچہ جو شخص بھی نبوت کا مقام و منصب سمجھتا ہے، فلسفۂ تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے اور تنقید کے اصول و قرائن سے کام لے کر ان بیانات کو پرکھ سکتا ہے،

وہ تحقیق کی گہری نظر ڈال کر صاف محسوس کرے گا کہ جہاں کہیں بھی قرآن اور تورات کے بیانوں میں اختلاف ہے وہاں تورات کے بیانات حقیقت کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتے اور یہ کہ حق قطعی طور پر قرآن ہی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

قرآن مجید کے لیے پچھلے انبیاء کرام کے قصوں کو اس طرح صحیح صحیح بیان کر دینا کہ موجودہ تورات کی غلطیوں کی بھی تصحیح ہو جائے، اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ اس کے یہ بیانات خدائے علیم و خبیر کی طرف سے ہیں اور وہ ضرور بالضرور آسمانی کتاب ہے۔

چھٹا ثبوت:۔ اس امر کا چھٹا ثبوت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں بہت سے ایسے علمی حقائق بھی بیان ہوئے ہیں جو اس کے نازل ہونے کے وقت تک پوری دنیا کے لیے عموماً اور عرب کے لیے خصوصاً سربستہ راز تھے اور سائنس و فلسفے کے اونچے حلقوں میں بھی کوئی اُن سے واقف نہ تھا۔ اس کے بعد جب صدیاں گزر گئیں اور علمی و سائنسی تحقیقات نے اپنی ترقی کے متعدد مرحلے طے کر لیے تب کہیں جا کر انہیں پایا جا سکا۔ مثلاً:۔

(الف) کائنات کی تخلیق کے بارے میں قرآن نے فرمایا تھا:۔

اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا۔	بیشک یہ سارے آسمان اور زمین پہلے سب کے سب باہم ملے ہوئے تھے تو ہم نے انہیں الگ الگ کیا۔
(سورۂ انبیاء ۳۰)	

"سارے آسمانوں اور زمین سے مُراد قرآن کی زبان میں پوری کائنات ہوا کرتی ہے، آیت کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات اپنی موجودہ ہیئت میں آنے سے پہلے 'پوری کی پوری' ایک ہی مادّے کی شکل میں تھی، ایک ہی قسم کی ایک مخصوص شئے تھی جو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پھر خالقِ حکیم نے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا، اور اُن سے مختلف اجرام کی صورت گری فرما دی۔ یہ مادہ کیا اور کیسا تھا؟ اس کی وضاحت بھی قرآن ہی کی ایک اور آیت (ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ) (حٰم سجدہ)

سے یہ ہوتی ہے کہ یہ بھی ایک طرح کا دھواں یعنی گیس تھا۔

(ب) جاندار مخلوقات کے متعلق اس نے بتایا تھا کہ ان سب کی اصل پانی ہے پانی ہی وہ چیز ہے جس سے ہر ذی حیات کی تخلیق ہوئی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ (انبیاء۔ ۳۰)

ہم نے (یعنی خدا نے) ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا ہے۔

(ج) جاندار اور غیر جاندار ساری مخلوقات کے بارے میں اس نے ایک بات یہ بیان کی تھی کہ:-

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ۔ (ذاریات۔ ۴۹)

ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

یعنی اس عالمِ وجود میں جو کچھ ہے اس کی ہر مخلوق کا اللہ تعالیٰ نے جوڑا اور مدّمقابل بھی پیدا کر رکھا ہے۔ تاکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرے اور دونوں مل کر ایک دوسرے سے تعاون کر کے وہ نتائج ظہور میں لائیں جو اس عالم کی مصلحتوں اور ضرورتوں کے لیے مطلوب ہیں، ایسا نہ ہو کہ مختلف اشیاء کے طبعی اختلافات انہیں باہم ٹکراتے رہیں اور اس کے نتیجہ میں یہ کارخانۂ ہستی پرسکون تعمیر و ترقی کے بجائے انتشار، خرابی اور تباہی کی نذر ہو جائے۔

(د) چاند اور سورج وغیرہ کی دائمی حالت اس نے یہ قرار دی تھی کہ:-

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ .... وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (یٰس، ۳۹، ۴۰)

سورج اپنے ایک مستقر کی طرف رواں دواں ہے، یہ غالب اور باخبر ذات باری کا ٹھہرایا ہوا ضابطہ ہے، اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں.... اور ہر ایک اپنے خاص دائرے میں برابر تیر تا (یعنی گھومتا) رہتا ہے۔

یقیناً یہ ساری باتیں آج ثابت شدہ حقیقتیں ہیں۔ علمی تحقیقات کہہ رہی ہیں کہ کائنات اپنی ابتدائی حالت میں ایک گیس کے خزانے کی شکل میں تھی، حیات کا سرچشمہ پانی ہے، مخلوقات کے اندر زوجیت کا قانون کارفرما ہے، چاند اور سورج اور سارے کُرے اپنے اپنے متعیّنہ مدار پر گردش کر رہے ہیں ـــ لیکن جس وقت قرآن حکیم ایسے یقین بھرے لب و لہجہ میں یہ سب کچھ فرمارہا تھا، اس وقت کے اہلِ علم وارباب تحقیق کو ان حقائق کا تصور بھی نہیں ہوسکا تھا۔ ان کا ثابت شدہ حقائق تسلیم کیا جانا تو دور کی بات ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن میں صدیوں پہلے ان علمی حقیقتوں کا تذکرہ کیسے آیا؟ اور یہ بات کیسے ممکن ہوسکی کہ عرب کے ایک اُمّی (روحی فداہُ) کی زبان سے کائنات کے وہ عظیم حقائق بیان ہوجائیں جو صرف اسی وقت نہیں، بلکہ اس کے بعد بھی ایک طویل زمانے تک علم و تحقیق کی نگاہوں سے بالکل مخفی رہے ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہے، اور وہ یہ کہ جس قرآن نے ان حقائق کی نشاندہی کی تھی وہ کسی انسان کی طرف سے تھا ہی نہیں، بلکہ اس خدا کی طرف سے تھا جو ساری کائنات کا خالق ہے اور جس نے خود ان حقائق کو اپنی کائنات کے اندر وجود بخشا ہے۔

ساتواں ثبوت:۔ اس حقیقت کا ساتواں ثبوت قرآنِ عظیم کا اچھوتا اندازِ بیان اور اس کی غیر معمولی بلاغت وقوّتِ تاثیر ہے۔

قرآن اگرچہ انسانی الفاظ ہی سے ترتیب پانے والا کلام ہے، اور اس میں بھی قدرتی طور پر وہی اصول و ضوابط کارفرما ہیں جو عربی زبان و ادب سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس کا نظم کلام اور اسلوب بیان ایسا ہے جو عربی ادب کے ذخیروں میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا، وہ ایک عجیب شانِ انفرادیت رکھتا ہے جو اپنی مثال آپ ہی ہے اس کی صحیح نوعیت کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن اور اسلام کے کسی عقیدت مند کی نہیں بلکہ اُس کے پُرجوش مخالفوں کی بعض شہادتیں سُنیے:۔ مشہور قریشی سردار، ولید بن مغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ آپؐ نے حسب دستور اُسے بھی قرآن پڑھ کر سُنایا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کلام الٰہی کے اثر سے اس کے دل کی سختی مات کھا چکی ہے

خاموشی سے گھر واپس چلا آیا۔ یہ خبر ابو جہل تک پہنچی، تو گھبرایا ہوا اس کے پاس آیا اور کہا۔ "چچا جان! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں (اپنی پوزیشن صاف کر دیجئے) اور کچھ ایسے الفاظ فرما دیجئے جن کو سن کر آپ کی قوم کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ آپ اس شخص کے دعوے کی صداقت تسلیم نہیں کرتے۔" ولید نے جواب دیا "آخر کیا کہوں؟ بخدا شعر ہو یا رجز، قصائد ہوں یا جنّی اشعار، غرض عربی کلام کی ایک ایک صنف کو میں تم سب سے بہتر جانتا ہوں خدا کی قسم یہ شخص جو کلام پیش کر رہا ہے، وہ ان میں سے کسی چیز کے بھی مشابہ نہیں۔ بخدا اس کے کلام میں ایک عجیب حلاوت اور ایک خاص طرح کا حسن ہے اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں اور اس کی جڑیں بڑی شاداب ہیں، یقیناً وہ ہر کلام سے بلند ہے اور کوئی دوسرا کلام اُسے نیچا نہیں دکھا سکتا، کوئی شک نہیں کہ وہ ہر اس چیز کو توڑ کر رکھ دے گا جو اس کے نیچے آجائے گی۔" (حاکم و بیہقی)

قریش کا ایک صاحبِ نظر سردار، عتبہ بن ربیعہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس ارادے کے ساتھ حاضر ہوا کہ آپ کی دعوت کا جائزہ لے۔ اور اس سے آپ کو باز رکھنے کی کوشش کرے۔ آپؐ نے اُسے سورۂ حٰم سجدہ سُنانا شروع کیا جب آیت فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ پر پہنچے تو اُس نے دہن مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ کر اور خونی رشتے کی دہائی دیتے ہوئے التجا کی کہ خدارا اَب آگے نہ بڑھیے اور پھر گھر واپس چلا آیا۔ ابو جہل نے اس کے پاس واپس جا کر اس ملاقات اور گفتگو کا حال معلوم کرنا چاہا تو اس نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا "خدا کی قسم اُس کا پیش کیا ہوا کلام نہ تو سحر ہے، نہ شعر ہے، نہ کہانت ہے۔ (بیہقی)

کلام کی بلاغت نام اس بات کا ہے کہ وہ سُننے والے کے دل میں اُتر جائے اور اس انداز سے اتر جائے کہ کلام سنانے کا جو اصل مقصد ہو وہ سننے والے کی عقل کو اطمینان اور دل کو سکون بخشتا ہوا پوری طرح حاصل ہو جائے..... بلاغت کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر جائزہ لیا جائے تو پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسا کلام نہیں ہے جو اپنی قوت تاثیر میں، اور دلوں اور دماغوں کو جیت لینے میں قرآن کے برابر پہنچ سکا ہو،

قرآن کی اس بلاغت کا، اس کی اس قوتِ تاثیر کا اور اس کی اس صفتِ تسخیر کا حال واقعات کی روشنی میں دیکھیے:۔

قریش[۱] کے سرداروں نے دعوتِ اسلامی کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے عوام کو جو ہدایتیں دے رکھی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ:۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝
(حٰمٓ سجدہ۔ ۲۵)

اس قرآن کو نہ سُنو، اور اس (کے سنائے جانے کے وقت شور و شغب کے ذریعہ اس) میں گڑبڑ ڈال دیا کرو۔ توقع ہے کہ اس طرح تم غالب رہو گے۔

اہلِ شرک کی یہ تدبیر و ہدایت واضح طور پر اس حقیقت کا اعتراف تھی کہ اگر عوام توجّہ سے اس قرآن کو سنتے رہے تو وہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

مکّے[۲] میں ایمان لانے والوں پر جب کفّار کی ستم رانیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک بار ہجرت کا ارادہ کر لیا، اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں ابن دغنّہ نامی ایک شخص ملا۔ اور آپ کو اپنی امان کا وعدہ کر کے مکّہ واپس لایا۔ جب یہاں کے لوگوں کو اس امان دہی کی خبر ملی تو انہوں نے ابن دغنّہ سے کہا ہم ابوبکر کو صرف اس شکل میں یہاں رہنے دیں گے کہ وہ قرآن زور سے نہ پڑھیں، اور ہماری عورتوں اور بچّوں کو سننے کا موقع نہ دیں۔ (ابن ہشام جلد ۱)

ابوجہل[۳] اور اخنس بن شریق سے بڑھ کر قرآن سے نفرت رکھنے والے اور اسلام کے مخالف اور کون رہے ہوں گے۔ مگر اپنی تمام تر نفرتوں، مخالفتوں کے باوجود ان کا بھی حال یہ تھا کہ ایک بار قرآن سُن لینے کے بعد اس کی غیر معمولی حلاوت اور اس کی پُرکشش بلاغت کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔ دن کو عناد و مخالفت کا بازار گرم کرتے مگر راتوں کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن سُن پاتے تو بڑھتے ہوئے قدم آپ سے آپ رُک جاتے، اور چھپ چھپا کر دیر تک اُسے سُنتے رہتے۔ (ابن ہشام، جلد اول)

حضرت[۴] عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک بار خانۂ کعبہ میں سورۃ النجم کی تلاوت فرمائی، حاضرین میں اہل ایمان اور اہلِ کفر ہر طرح کے لوگ موجود تھے، جب آپ آیت سجدہ پر پہنچے تو حکمِ خداوندی کے مطابق سر سجدے میں ڈال دیا، آپ کو سربسجود ہوتے دیکھ کر (صرف ایک شخص، ابو لہب کے علاوہ) سارے حاضرین بھی سجدے میں گر گئے۔ (بخاری)

غور کیجیے مسلمانوں سے تو یہ سجدہ حکمِ شریعت نے کرایا تھا، مگر اہل کفر کی پیشانیاں کیوں جھک پڑیں؟ کوئی شک نہیں کہ یہ کلامِ الٰہی کی مسحور کرنے والی بلاغت تھی جس کی حیرت انگیزیوں اور لذتوں میں وہ کھو گئے تھے اور انہیں اس کا کوئی احساس نہ تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔؟

طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبیلے کا سردار اور ایک بڑا شاعر تھا۔ ایک روز مکّہ آیا۔ تو قریش کے کچھ لوگ اس کے پاس پہنچے، اور اُسے خبردار کرتے ہوئے بولے دیکھیے اس شخص، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ہرگز نہ جائیے گا، اور نہ اس کی باتیں سنیے گا۔ کیونکہ اس کے کلام میں بلا کا جادو ہے، اسے سُن کر آدمی اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ پاتا، لیکن طفیل نے ان کا کہا نہ مانا، اور تحقیق حال کے فطری تقاضے نے اسے آپ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آپؐ نے اسے قرآن پڑھ کر سُنایا تو وہ بے اختیار بول اٹھا۔ "بخدا اس سے اچھا کلام میں نے کبھی نہیں سنا" اور یہ کہہ کر اپنے ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمنوں میں سے تھے ایک دن جوشِ غضب میں تلوار اٹھا کر اس عزم کے ساتھ نکلے کہ آج اس فتنہ کا خاتمہ ہی کر دوں گا۔ مگر راستے ہی میں اپنے بہن کے گھر سورۂ طٰہٰ سننے کا اتفاق پیش آ گیا، اس کا سننا تھا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی دشمنی ایمان و عقیدت سے بدل گئی۔ (ابن ہشام جلد ۱)

جبیر بن مطعم راستہ میں چلے جا رہے تھے۔ آنحضرت مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے۔ ٹھیر کر سننے لگے، اور سورۃ کے الفاظ تیر بن کر دل میں اترتے گئے بالآخر وہیں حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

قرآن کی مسحور کن بلاغت کا کمال اس حال میں ہے کہ وہ کوئی شعر اور ادب کی کتاب نہیں، بلکہ اخلاقیات، مواعظ اور احکام و ہدایات کی کتاب ہے۔ فصاحت و بلاغت کے کمالات کا اصل میدان شعر و ادب اور رجز کی دنیا ہے۔ چنانچہ تاریخِ عالم میں جن لوگوں نے اپنے کمالِ بلاغت کا سکّہ بٹھایا ہے، انھوں نے ادبی مضامین اور شعر و شاعری ہی کے ذریعہ بٹھایا ہے، ایسی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی کہ کسی نے اخلاق اور مذہب جیسے خشک موضوعات پر بولتے یا لکھتے ہوئے بلاغت کا کوئی اچھوتا معیار قائم کیا ہو۔ پھر ادبی مضامین اور رجز و اشعار کا بھی حال یہ ہے کہ کسی اونچی سے اونچی تخلیق میں بھی شروع سے آخر تک زورِ بلاغت کا رنگ یکساں طور پر قائم نہیں رہتا، اس کے کچھ حصّے اگر معیاری حد تک بلیغ ہوں گے تو بہت سے اجزاء عام سطح کے بھی ہوں گے۔ مگر قرآن کا حال بالکل مختلف ہے۔ وہ دینی ہدایات اور شرعی احکام کی کتاب ہوتے ہوئے بھی بے نظیر بلاغت کا حامل ہے، اور اس بلاغت کی خلعتِ زیبا اس کی پوری قامت پر پڑی ہوئی ہے۔ عقلِ انسانی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ صورتِ واقعہ وجود میں نہیں آسکتی تھی اگر قرآن انسانی کلام ہوتا، اس لیے یہ نہ حضرتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام ہے نہ کسی اور بشر کا، یہ قطعاً اس خدا کا کلام ہے جو سارے اہلِ بلاغت کی طرح خود کمالِ بلاغت کا بھی خالق ہے۔

آٹھواں ثبوت: ۔ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا آٹھواں ثبوت اس کی تعلیمات ہیں، کیونکہ ان تعلیمات کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف تو اُن میں غایت درجہ کا اعتدال اور فطری عقلیت پائی جاتی ہے، دوسری طرف وہ انسانیت کے لیے ایک جامع ترین ہدایت نامہ ہیں، ان میں الٰہیات کے ضروری حقائق اور دین کے اصول و عقائد کی تفصیل بھی ہے اور انسانی اخلاق و آداب کی تشریح بھی ہے معبودِ برحق کی پرستش کے متعلق جامع ہدایات بھی ہیں اور اس کے حقوق کے متعلق مفصل تلقینات بھی ہیں، فرد کی تربیت کے خطوط بھی ہیں او معاشرے کی تعمیر کے اصول بھی ہیں، خاندانی معاشرتی، تمدنی، معاشی اور سیاسی احکام بھی ہیں اور صلح و جنگ کے آداب و قوانین بھی ہیں، ان تعلیمات میں سے جہاں تک اجتماعی احکام کا تعلق ہے، ان کی نوعیت

دنیا کے سارے نظاموں سے الگ ہے، اور وہ ہر قوم، ہر زمانے، اور ہر ملک کے لیے یکساں طور پر موزوں ہیں، صدیوں تک موزوں ثابت ہو چکے ہیں، اور آئندہ بھی جب کبھی انہیں اپنایا جائے گا موزوں ہی ثابت ہوں گے۔ پھر یہ تعلیمات اپنی معقولیت اور صداقت پر اور اپنے عملی نتائج کی خوبی پر مضبوط دلائل اور ناطق شہادتیں بھی رکھتی ہیں، اُن کی بنیاد پر انسانی زندگی کی جب بھی تعمیر کی گئی اُسے مسرت ہی مسرت ملی۔۔۔ سوچیے کیا یہ بے نظیر تعلیمات حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنے ذہن کی پیداوار تھیں۔؟

یہ سوچتے وقت دو بدیہی حقیقتوں کو لازماً سامنے رکھیے۔ ایک[1] تو یہ کہ مابعد الطبیعی، یہ دینی، یہ اخلاقی، یہ تمدنی اور یہ سیاسی علوم و مباحث جن کے سلسلے میں قرآن حکیم نے اتنی کامیابی سے کلام فرمایا ہے، معمولی درجے کے علوم و مباحث نہیں، بلکہ ایسے اونچے علوم ہیں جن میں گفتگو کا حق اور بصیرت کا مقام حاصل کرنے کے لیے عمریں کھپا دی جاتی ہیں، تب کہیں جا کر اکّے دکّے افراد کو یہ حق اور مقام حاصل ہو پاتا ہے۔ دوسری[2] یہ کہ جس شخص نے قرآن کو پیش کیا تھا، اس کے حالاتِ زندگی یہ ہیں کہ وہ عرب جیسے پسماندہ ملک میں پیدا ہوا تھا اس کا بچپن یتیمی میں گزرا تھا، نوجوانی گلّہ بانی میں اور جوانی کاروبارِ تجارت میں بسر ہوئی تھی۔ وہ اُمّی (اَن پڑھ) تھا۔ اسے تعلیم و تدریس کی ہوا بھی نہ لگی تھی وہ اہلِ فن کے ناموں سے بھی واقف نہ تھا۔ اسے مکّے کے لوگ ایک خاموش، بااخلاق، امن پسند، راست باز اور شریف شہری کی حیثیت سے تو ضرور جانتے تھے مگر چالیس سال کی عمر تک کسی نے اُس کو کبھی علم و حکمت کی باتیں کرتے نہ سنا تھا کسی نے اسے الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق پر، زندگی کے اجتماعی مسائل پر، قانون اور سیاست پر ایک دن بھی بحث کرتے نہ پایا تھا، کسی نے اُسے وجودِ باری، توحیدِ الوہیت، وحی اور رسالت، آخرت اور جزا و سزا، جنت اور دوزخ، آسمانی کتابوں اور پچھلی نبوّتوں پر کبھی ایک لفظ کہتے نہ سنا تھا، لیکن اپنی چالیس سالہ زندگی کے اس بے رنگ اور سادہ پس منظر کے بعد اس نے یکایک دنیا کو وہ کلام سنانا شروع کر دیا۔ جو ان بے نظیر تعلیمات پر مشتمل تھا۔ کوئی شک نہیں کہ ان دونوں حقیقتوں کو، جو دوپہر کے سورج کی طرح ناقابلِ انکار ہیں، سامنے رکھ کر غور کرنے والا کوئی بھی شخص کبھی یہ باور

نہیں کر سکتا کہ یہ تعلیمات آنحضرتؐ کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں، اس کے برخلاف اس کا فیصلہ صرف یہ ہوگا کہ یہ تعلیمات وحی الٰہی کا نتیجہ نہیں، جیسا کہ ان کے پیش کرنے والے نے بار بار زور دے کر اور پوری صراحت سے فرمایا ہے۔

نواں ثبوت:۔ اس دعوے کا نواں ثبوت وہ نتائج ہیں جو قرآن کی پیروی نے دنیا کے سامنے پیش کیے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سچے انبیاء کی پہچان یہ بتائی ہے کہ "تم انہیں ان کے پھلوں سے پہچانو گے"۔ یہی بات خود قرآن نے بھی ایک اور انداز میں اس طرح فرمائی ہے کہ "کلمہ طیبّہ (یعنی دعوتِ قرآنی) کی مثال ایک اچھی ذات کے درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہوں اور وہ ہر وقت اپنے رب کے اِذن سے بہترین پھل دیتا رہتا ہے۔ (ابراہیم ۲۴، ۲۵) گویا کسی کتاب کے کتابِ الٰہی ہونے کی واضح ترین علامت یہ ہے کہ وہ نظری اور عملی ہر حیثیت سے انسان کو کتنا راست رو، صالح اور بامراد بناتی ہے۔ اگر کسی نبی اور کتاب کی صداقت معلوم کرنے کے لیے یہ ایک صحیح اور کامیاب کسوٹی ہے، اور کوئی شک نہیں کہ بات یونہی ہے، تو تسلیم کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی اور قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کیونکہ مذاہب کی معلوم تاریخ میں کوئی اور کتاب نہیں جو اس معیار پر قرآن سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی ہو۔ اس کتاب کے ذریعہ جو انقلاب وجود میں آیا، اس سے زیادہ عظیم، زیادہ مکمل اور زیادہ صالح انقلاب کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ بارہ لاکھ مربع میل کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے جنگجو، سرکش، جاہل اور منتشر عربوں کو اس کتاب نے دنیا کی سب سے زیادہ انسانیت نواز، منظم، نرم خو، اور خیر پسند قوم بنا دیا۔ اُس کی تعلیمات نے ایسے افراد تیار کیے جن کا وجود کمالِ انسانیت کی شرح تھا، ایسا معاشرہ بنایا جو سراپا عدل و احسان تھا، ایسی ریاست قائم کی جو اس زمین پر صحیح معنوں میں آسمانی بادشاہت تھی قرآن کے دیے ہوئے ان "پھلوں" کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنے بارے میں جو دعویٰ کیا تھا وہ غلط اور جھوٹا تھا؟ برائی کی بیل سے بھلائی کا اور جھوٹ کی شاخ سے سچائی کا پھول آج تک کبھی نہیں کھلا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کتاب اور دعوت کی

بنیادہی جھوٹ اور فریب پر ہو اس سے دنیا میں راست بازی اور دیانت کی بہاریں آگئی ہوں۔

دسواں ثبوت:۔ اس کا دسواں ثبوت عجز کی وہ مکمل خاموشی ہے جو قرآن کی تحدّی (چیلنج) کے جواب میں اختیار کی گئی۔ قرآن کے منکروں نے جب ہر دلیل کی طرف سے اپنے کان بند کر لیے، اور اسے اللہ کی کتاب نہ تسلیم کرنے پر پیہم اصرار کرتے رہے تو اس نے اپنے نازل کرنے والے کی طرف سے اُنہیں چیلنج دیا کہ:۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(بقرہ - ۲۳)

اگر تمہیں اس کتاب کے بارے میں جسے ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر اتارا ہے، (ہماری جانب سے ہونے میں) کوئی شک ہے تو اس جیسی کوئی ایک ہی سورت بنا لاؤ، اور اس غرض کے لیے اللہ کو چھوڑ کر اپنے سارے نمائندوں کو بھی بلا لو۔ اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو۔

یعنی اگر تم اپنے اس خیال کو صحیح سمجھتے ہو کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ ایک انسان کا کلام ہے، تو یہ بحث تمہارے حق میں ابھی ختم ہو سکتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ تم بھی لفظی اور معنوی صفات کی حامل ایسی ہی ایک کتاب جیسا کہ قرآن ہے تصنیف کرلاؤ۔ بلکہ اس کی جیسی کوئی ایک ہی سورت بنا کر پیش کر دو۔ پھر اس سلسلے میں تم پر یہ بھی کوئی قید نہیں کہ تم میں سے کوئی ایک ہی فرد یہ کام کر دکھائے۔ اس کے بخلاف تم کو اس معاملہ میں پوری آزادی دی جاتی ہے۔ تم سب مل کر، اور جس کسی کو بھی اپنی مدد کے لیے تم بلانا چاہو سب کو بلا کر کوشش کر ڈالو، حتیٰ کہ پوری نوع انسانی کو اس کام کے لیے اکٹھا کر لینے کی تمہیں پوری چھوٹ حاصل ہے۔ اگر تم نے اس طرح اس چیلنج کا کامیاب جواب دے دیا تو قرآن کا انسانی کلام ہونا مسلّم ہو جائے گا، اور پھر وہ اپنے کو کلام الٰہی کہنا ترک کر دے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اگر تنِ تنہا صرف ایک شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یہ قرآن تصنیف کر سکتا ہے

جو اُمّی بھی ہے اور جس کی خطابت یا شاعری کا آج تک کوئی شہرہ بھی نہیں سُنا جا سکا ہے تو تمہارے پورے گروہ کے لیے جس میں بڑے بڑے شاعر اور نامور خطیب موجود ہیں، اُس کا جواب مرتب کر کے پیش کر دینا ذرا دشوار نہ ہوگا۔ تم بڑی آسانی سے اس چیلنج کو قبول کر کے اس شخص کا مُنہ بند کر سکتے ہو۔ یہ چیلنج اُن عربوں کو دیا گیا تھا جن کو اپنے حُسنِ بلاغت کی یکتائی پر ناز تھا اور جو اپنے کمالِ خطابت کے پندار میں بجا طور پر باقی ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہا کرتے تھے، مگر پورا عرب اس چیلنج کو سُن کر خود گونگا بن گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان لوگوں کے اندر قرآن مجید کو انسانی کلام ثابت کر دینے کی کتنی بے پناہ خواہش تھی۔ یہ قطعی ناممکن تھا کہ اپنی اس خواہش کے پورا کر لینے کی کوئی شکل اور کوئی تدبیر ان کے بس میں ہوتی اور وہ اُسے اختیار کرنے میں ایک لمحہ کی بھی دیر لگاتے۔ انہوں نے قرآن کو کتابِ الٰہی نہ مان کر کون سا زیان تھا جو برداشت نہ کیا؟ سیادت اُن کی چھنی۔ قید و بند کی ذلتیں انہوں نے اٹھائیں۔ خانۂ کعبہ سے اپنے آبائی معبودوں کی جلاوطنی اور نگوں ساری کا روزِ بد، انہیں دیکھنا پڑا، خاک و خون میں وہ نہائے۔ مگر اِن خطرات اور بدترین انجاموں سے بچنے کے لیے جو ایک آسان سی تدبیر اُن کے سامنے رکھدی گئی تھی اُسے انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا، حالانکہ اس کے لیے انہیں بار بار متوجہ کیا گیا۔ مکہ میں بھی کئی بار ان کے سامنے یہ چیلنج رکھا گیا، اور پھر مدینے میں بھی اُسے دُہرایا گیا۔ مگر انہوں نے کبھی اُسے قبول نہیں کیا۔ کیا عقل مان سکتی ہے کہ قبول کر لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود انہوں نے از خود ایسا نہیں کیا۔؟

یہ چیلنج آج بھی اپنی جگہ بدستور موجود ہے۔ دنیا کی دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن کریم کی زبان مُردہ بھی نہیں ہو چکی ہے۔ بلکہ اپنے قدیم و جدید ہر طرح کے سرمایوں کے ساتھ زندہ ہے۔ اور اس کے بولنے اور جاننے والوں میں بڑے بڑے نامور ادیب اور عالم موجود ہیں، جن کے اندر اسلام کے کٹر مخالفوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ چاہیں تو اس چیلنج کو قبول کر لیں، مگر پونے چودہ سو برسوں کی خاموشی لبوں کو حرکت دیتی نظر نہیں آتی۔

یاد رہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کے پھیل جانے اور اُن کے ہمراہ

قرآن مجید کے لاکھوں کروڑوں نسخوں کے پہنچ جانے کے باعث یہ چیلنج پہلی صدی ہجری ہی سے اشاعتِ عام پا چکا ہے۔ اگر اسے کبھی بھی اور کہیں بھی قبول کیا جا سکا ہوتا تو یہ ایک ایسا واقعہ ہوتا جو قدرتی طور پر پوری دنیا میں مشہور ہو گیا ہوتا، کیونکہ اسلام اور قرآن کے مخالفوں کے لیے یہ 'فتح مبین' ایک عظیم ترین نعمت ہوتی۔ وہ اس کی خبر کو، بلکہ قرآن کے اس جواب کو بھی، اس کی تردید میں پورے جوش و انہماک سے ہر طرف پھیلا دیتے، اور اُس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ غیر مسلم دنیا قرآن سے اپنے انکار پر دلیل و برہان کا اطمینان پا لیتی، بلکہ یہ واقعہ خود مسلمانوں کے لیے بھی ارتداد کا ذریعہ بن جاتا، لیکن اس حقیقت کا مسلم اور غیر مسلم، سبھی کو اقرار ہے کہ تاریخ اس قسم کے کسی بھی واقعے کے ذکر سے یکسر خالی ہے۔

گیارھواں ثبوت:- قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا آخری ثبوت اس کے 'عینی شاہد' کی شہادت ہے۔ اس قرآن کے پیش کرنے والے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ آپ نے اسے اپنی جانب سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیش کیا ہے یعنی آپ کا کہنا ہے، اور بار بار کا کہنا ہے، کہ یہ کلام جو میں پیش کر رہا ہوں، مجھ پر اللہ رب العالمین کی طرف سے اترا ہے۔ وہ اپنے بزرگ فرشتہ (جبرئیل امین) کو میرے پاس بھیجتا ہے، اور وہ مجھے یہ کلام سُنایا کرتا ہے۔ پوچھا جائے گا کہ آخر کیا ضرور ہے کہ آپ کی اس بات اور آپ کی اس گواہی کو سچ ہی باور کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی شخصیت وہ شخصیت ہے جس کی راست گوئی ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہی ہے۔ صرف اپنوں ہی کے نزدیک نہیں بلکہ غیروں کے نزدیک بھی۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ آپ کی مخالفت میں عرب کے لوگوں نے وہ سب کچھ کر اور کہہ ڈالا جو اُن کے بس میں تھا۔ مگر انہوں نے اس اعتراف سے کبھی انکار نہیں کیا کہ آپ ایک سچے اور امانت دار انسان ہیں۔ نبوّت سے پہلے اہل مکّہ نے، اُن کے عوام و خواص دونوں نے آپ کو "صادق" اور "امین" کا لقب دے رکھا تھا۔ اعلانِ نبوّت کے بعد اگرچہ انہوں نے خاص اس دعوے کی حد تک آپؐ کی تصدیق نہیں کی، اور آپ کے بار بار کہنے کے باوجود قرآن کو کلامِ الٰہی تسلیم نہیں کیا، مگر جہاں تک اس خاص معاملے کا سوا دوسرے امور و معاملات کا تعلق ہے وہ آپ کی راست گوئی اور دیانت کے

اب بھی پوری طرح معترف تھے۔ ابوسفیان جیسے جانی دشمن سے جب قیصر نے اپنے دربار میں پوچھا کہ "کیا نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے اس شخص پر تم لوگوں نے کبھی جھوٹ بولنے کا الزام لگایا تھا"؟ تو انہوں نے اپنے انتہائی جذبۂ عداوت کے باوجود وہاں، کہنے کی کوئی گنجائش نہیں پائی، اس نے پھر پوچھا کہ "کیا یہ شخص وعدہ خلافی کرجاتا ہے"؟ تو انہیں پھر کہنا پڑا کہ "نہیں" "ابھی تک تو اس نے ایسا کبھی نہیں کیا ہے، البتہ اس وقت ہمارے اور اس کے درمیان ایک معاہدہ صلح (صلح حدیبیہ) نافذ ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے بارے میں اس کا کیا رویہ رہے گا۔" (بخاری باب بدء الوحی) اسی طرح دشمنانِ اسلام کے سرگروہ، ابوجہل نے ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے دوران خود کہا کہ "ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، لیکن جو باتیں آپ پیش کررہے ہیں ہم انہیں جھوٹ ہی سمجھتے ہیں" (حاکم) غزوۂ بدر کے موقع پر اس کے ایک ساتھی، اخنس بن شریق نے تنہائی میں اس سے پوچھا "ٹھیک ٹھیک بتاؤ، تم محمد کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا"؟ اس نے جواب دیا "بخدا محمدؐ ایک سچا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے" (ابن جریر) ان حقائق کو سامنے رکھیے، پھر فیصلہ کیجیے کہ قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کی جو شہادت آپؐ نے دی ہے اُسے سچا ماننا ضروری ہے یا نہیں؟ یعنی کیا عملاً یہ ممکن ہے کہ جو شخص راست گوئی اور صداقت شعاری اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا ہو، اور جس نے کسی انسان سے کسی معاملہ میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، وہ اپنے خدا کے نام پر ایسا دھڑلّے سے جھوٹ بول دے گا؟ اس خدا کے نام پر جو سب کچھ جانتا رہتا اور سنتا رہتا ہے، جس کی قدرت سے کوئی چیز بھی باہر نہیں ہوسکتی اور جو دونوں جہان کا فرمانروائے مطلق ہے۔ پھر جھوٹ بھی ایسا کہ جو ایک دوبار نہیں، بلکہ مسلسل تیئیس ۲۳ برس بولا گیا ہو، اپنے کسی دشمن پر بھی کبھی افترا نہ کرنے والا اپنے پروردگار پر ہمیشہ افترا کرتا رہا! انسانی معاملات میں ایک بار بھی جھوٹ نہ بولنے والا خدا کے معاملے میں ایک بار بھی سچ نہ بول پایا! کیا نفسیات کا مطالعہ، تجربات کی گواہی، عقل کا جائزہ، کوئی چیز بھی اس عجیب وغریب بات کی تائید کرسکتی ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں، اس لیے حق تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت، قرآن کے کتابِ الٰہی

ہونے کا ایک ایسا ثبوت ہے جس کے بعد کسی سلیم الطبع انسان کے لیے کسی اور نبوت کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر خاصی تعداد میں دلیلیں آپ کے سامنے آچکیں ان دلیلوں کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ کسی کتاب کے آسمانی کتاب ہونے پر جو فطری وجوہ استدلال ہو سکتے ہیں، یا جن وجوہِ استدلال کو ضروری قرار دیا جاسکتا ہے، ان دلیلوں میں وہ سب کے سب موجود ہیں۔ ان با ضابطہ دعوے کی موجودگی کا ابتدائی ضروری ثبوت بھی ہے، داخلی صفات کے دلائل بھی ہیں۔ نتائج اور ثمرات کی گواہیاں بھی ہیں، پھر مثبت دلیلیں بھی ہیں اور منفی دلیلیں بھی۔ ان دلائل کو دیکھ کر انصاف اور حق پسندی کا فیصلہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کسی اظہار و بیان کا محتاج نہیں۔ یقینی طور پر یہ فیصلہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ قرآن بھی اسی فیضانِ ہدایت کا ایک درخشاں ظہور ہے، جو انسانوں کے خالق و پروردگار کی طرف سے جاری رہا ہے، اور اس کے کلام الٰہی ہونے میں ذرا بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کا تعلّق

ہدایتِ الٰہی کے بارے میں اگرچہ عقل و فطرت ہی بتا دیتی ہیں کہ وہ انسان کی سب سے اہم ضرورت ہے اور اس کا آنا اور ملنا بالکل ناگزیر تھا، اسی طرح تاریخ اس امر کی مسلسل شہادت دے چکی ہے کہ وہ آئی بھی۔ لیکن اب اس اہم ترین مسئلے کے بارے میں ایسے بہت سے بنیادی سوالات اٹھتے ہیں جن کا جواب ملنا بہت ضروری ہے مثلاً یہ کہ یہ سلسلہ کس طرح جاری رہا ہے؟ اور اس کے مسلسل جاری رہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ ہمیشہ ایک ہی سی رہتی رہی ہے یا اس کی نوعیت بدلتی رہی ہے؟ اگر ایک ہی سی رہتی رہی ہے تو بنیادی طور پر وہ کیا تھی؟ اور اگر اس کی نوعیت بدلتی رہی ہے تو اب تک کیا کیا ہدایتیں آچکی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا تسلّی بخش جواب کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتا۔ یہ اگر مل سکتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی مل سکتا ہے۔ جس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کی طرف رجوع کیا

جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں، جس کے کتاب الٰہی ہونے پر ہم ابھی ہر طرح کے دلائل کی یقین آفریں شہادتیں سُن چکے ہیں، تو وہ ہمیں ان ساری باتوں کی پوری تفصیل بتا دیتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

دنیا میں ہدایت الٰہی کا نزول اسی وقت شروع ہو گیا تھا جس وقت کہ یہاں پہلے انسان نے قدم رکھا تھا۔ یہ ہدایت بنیادی طور پر یہ تھی کہ اس پوری کائنات کے مالک نے تم انسانوں کو اس دنیا میں اپنا 'خلیفہ' اور نائب بنا کر پیدا کیا ہے، جس کے لیے تمہیں ایک حد تک ارادے اور اختیار کی آزادی بھی عطا فرمائی گئی ہے۔ اس لیے تم اپنے عمل میں، اور اس دنیا کے برتنے میں آزاد ہو، تم جو رویّہ چاہو اختیار کر سکتے ہو لیکن تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمہارا وہی رویّہ صحیح ہوگا جو اپنے خالق اور اپنے آقا کی حیثیت کے صحیح اقرار اور اس کے حقوق کے صحیح اعتراف پر مبنی ہو "اس کی حیثیت کا صحیح اقرار" یہ ہے کہ اپنے کو نہ تو بالکل آزاد و خودمختار سمجھو نہ اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ خیال کرو، بلکہ ایک طرف تو اپنے کو صرف بندہ یقین کرو، دوسری طرف اللہ ہی کو اپنا فرمانروا اور معبود جانو، اور اس کے سوا کسی اور کو اپنی اطاعت اپنی پرستش اور اپنی رضا جوئی کا حق دار نہ سمجھو، اس کے حقوق کا اعتراف یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کی مرضیات کے حوالے کر دو۔ وہ تمہیں زندگی بسر کرنے کے لیے جو احکام دے، اپنی زندگی ٹھیک اُنہی کے مطابق بسر کرو۔ یہ دنیا دراصل ایک آزمائش گاہ ہے، جہاں تم اختیار کی آزادی دے کر پیدا ہی اس لیے کیے گئے ہو کہ دیکھا جائے آیا تم اپنے اس اختیار کو از خود اس کی طاعت و بندگی کا فریضہ بجالانے ہی میں استعمال کرتے ہو یا نہیں؟ چنانچہ ایک روز تمہیں اپنی یہ زندگی ختم کر کے ایک دوسرے عالم میں داخل ہونا ہوگا۔ جہاں وہ تمہاری دنیاوی زندگی کے رویّے اور سارے اعمال کو دیکھ کر فیصلہ کرے گا کہ تم میں سے کون اس آزمائش میں کامیاب رہا ہے، اور کون ناکامیاب ثابت ہوا ہے؟ جس شخص نے یہاں زندگی کا صحیح رویّہ اپنایا ہوگا اُسے یہاں بھی سکون و اطمینان میسّر ہوگا اور وہاں بھی ابدی راحت اور مسرّت کا گھر ملے گا، جس کا نام جنّت ہے۔ اور جو اس رویّہ کے اپنانے میں ناکام رہے گا، اس کی یہ زندگی بھی بے چینی اور پریشانی میں بسر ہوگی، اور وہاں پہنچنے

پر بھی اسے ابدی غم اور مصیبت کے ہولناک گڑھے میں پھینک دیا جائے گا جس کا نام جہنم ہے
اس ہدایت کے ساتھ انسان نے اپنی زندگی شروع کی۔ لیکن جب ایک لمبی مدت گزر گئی تو
اس ہدایت سے بے پروا کر دینے والے محرکات نے زور دکھایا، اور پھر ایک وقت ایسا آگیا
جب لوگ اُسے یکسر بھُلا بیٹھے اور صحیح رویہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل کھڑے ہوئے۔ قدرتی
طور پر اللہ کی رحمت نے پھر توجہ فرمائی، اور ہدایت کا یہ بجھا ہوا چراغ اس نے پھر روشن
کر دیا، تاکہ آنے والی نسلیں اندھیرے میں رہ کر غلط راستوں ہی میں بھٹکنے کے لیے مجبور نہ
ہو رہیں، آگے چل کر اولادِ آدم زمین کے دور دراز گوشوں میں پھیل گئی اس لیے اللہ تعالیٰ
نے حسبِ ضرورت ہر خطے کے لوگوں کے لیے الگ الگ ہدایت نامے بھیجے، لیکن ہر ہدایت نامے
کے ساتھ بالآخر وہی سلوک ہوتا رہا جو پہلے ہو چکا تھا۔ اُسے غفلت کی نذر کر دیا گیا، بھلا دیا
گیا، بالقصد مسخ کر کے اپنی خواہشوں کے مطابق ڈھال لیا گیا، اس لیے ضرورت پیش آئی
اور برابر آتی رہی کہ اللہ اپنے محروم بندوں کو اپنی ہدایت سے پھر بہرہ ور کرے۔ یہ سلسلہ
چلتا رہا۔ یہاں تک کہ قرآن نامی ہدایت نامہ نازل ہوا، جو اس سلسلۂ رحمتِ الٰہی کی آخری کڑی
تھا، بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے سارے ہداین نامے بالکل ایک تھے ان میں
اگر کوئی فرق و اختلاف تھا تو وہ صرف تفاصیل اور جزئی احکام کا اختلاف تھا۔ مقاصد
اور اصول میں ہرگز کوئی اختلاف نہ تھا۔ مقاصد اور اصول کے لحاظ سے تو قطعی طور پر ایک ہی
پیغام اور ایک ہی فرمان تھا جو معبودِ برحق کی جناب سے ہمیشہ اپنے بندوں کے پاس آتا رہا۔

مسئلۂ ہدایت الٰہی کے بارے میں ان وضاحتوں کے سامنے آجانے کے بعد
ایک بڑی اہم حقیقت روشنی میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے
ہدایت نامے آئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی کسی کا حریف نہ تھا، اور چونکہ قرآن مجید بھی
ان ہی میں سے ایک ہے اس لیے اس کی بھی نوعیت اور حیثیت کوئی دوسری نہیں ہو سکتی
یقینی طور پر وہ بھی دوسری آسمانی کتابوں کا حلیف اور 'اتحادی' ہے۔ اُن کا حریف
اور مدِّ مقابل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا بھی مقصدِ نزول ٹھیک وہی ہے جو دوسری
کتابوں کا تھا، اور اس کی تعلیمات کی بنیادیں اور اصولی باتیں بھی وہی ہیں جو دوسرے

ہدایت ناموں کی رہی ہیں اس لیے ان سے اس کا تعلق اختلاف اور مقابلے کا نہیں، بلکہ اتحاد و یک جہتی کا ہے۔ چنانچہ اس نے اس حقیقت کو پوری صراحت سے بیان بھی کر دیا ہے مثلاً وہ اپنے مخاطب لوگوں کو فہمائش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:-

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ (شوریٰ ۱۳)	اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر فرمایا ہے جس کی اس نے نوحؑ کو تلقین کی تھی اور جس کی (اے محمدؐ) ہم نے تم پر وحی کی ہے، اور جس کی ہم نے ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو وصیت کی تھی، یہ کہ اس دین کو قائم کرو اور اس کے اندر اختلاف و تفریق نہ اختیار کرو۔

پھر یہی نہیں کہ قرآنِ حکیم نے صرف اپنے عام مخاطبین ہی کو یہ عظیم حقیقت یاد دلا رکھی ہے، بلکہ خود اپنے لانے والے پیغمبرؐ تک کو بھی اس نے ایسا ہی ذہن نشین کرا رکھا تھا، چنانچہ پچھلے بہت سے نبیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ:-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ (انعام-۹۰)	یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت عطا فرمائی تھی سو (اے محمد!) تم (بھی) انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔

غرض یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے اپنی اصل ہدایت کو پچھلی ہدایتوں اور کتابوں ہی کا ایک جدید نقش قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ مجھ میں اور ان میں ہرگز کوئی دوئی اور علیحدگی نہیں۔ اب یہ بالکل دوسری بات ہے کہ آج جن کتابوں کے آسمانی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں پائی جانے والی بنیادی ہدایات اور تعلیمات بھی قرآنی تعلیمات سے بہت کچھ مختلف ہیں، کیونکہ اس صورتِ حال کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ کتابیں فی الواقع آسمانی بھی ہیں اور ساتھ ہی یہی ان کی اصل تعلیم بھی تھی، بلکہ یہ ہے کہ یا تو یہ کتابیں آسمانی نہیں، یا پھر ان کی اصل تعلیم ان کے علم برداروں کی غفلت، ناقدری

اور تحریف کی نذر ہو چکی ہے۔ ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی بھی ایسا ہدایت نامہ نازل ہوا ہو جس کی اصولی تعلیمات قرآن سے ہم آہنگ نہ رہی ہوں۔

قرآن کے خصوصی امتیازات

لیکن اس حقیقت کے باوجود، کہ قرآن دوسری آسمانی کتابوں کا حریف نہیں ہے بلکہ حلیف ہے اور اس کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جو اُن کی تھیں، وہ اُن کے مقابلے میں بعض خصوصی امتیازات کا بھی مالک ہے، اور اس لیے اُسے ایک ایسی حیثیت بھی حاصل ہے جو اسی کے لیے مخصوص ہے۔ ان امتیازات کا دعویٰ یا ذکر و اعلان خود اس نے اور اس کے لانے والے پیغمبر نے کیا ہے، اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) قرآن کا نزول کسی خاص قوم یا خطے کے لیے نہیں، بلکہ پوری دنیا کے لیے ہوا ہے پوری نوعِ انسانی اس کی مخاطب ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ	بڑی برکتوں والا ہے وہ (اللہ) جس نے
عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ	یہ حق و باطل کو پوری طرح واضح کر دینے
نَذِيْرًا ۝	والا (قرآن) اپنے بندے پر نازل کیا ہے،
(فرقان، ۱)	تاکہ وہ سارے جہان کو خبردار کرے۔

اسی طرح اس نے بار بار فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے میرے لانے والے پیغمبر (محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم) کو سارے انسانوں کا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔" (سورہ سبا، آیت، ۲۸) اور سورۂ اعراف آیت ۱۵۸) اس کے ان ارشادات کا بھی لازمی مفہوم یہی ہے کہ وہ سارے انسانوں کے لیے نازل فرمایا گیا ہے۔

یہ مقام اس سے پہلے کی کسی کتاب کو حاصل نہ تھا، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کر دی ہے کہ "مجھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر صرف اپنی ہی قوم کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا"، (بخاری) دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن سے پہلے کی ہر آسمانی کتاب صرف کسی خاص قوم ہی کے لیے نازل کی گئی تھی۔

(۲) قرآن ہر جہت سے ایک مکمل ہدایت نامہ ہے۔ وہ ایک ایسا دین ہے، ایک ایسی شریعت ہے، ایک ایسا نظامِ فکر و عمل ہے، جس میں انسان کے اعتقادی اور عملی، ظاہری اور باطنی، انفرادی اور اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی، غرض ایک ایک شعبۂ زندگی سے متعلق ہدایات موجود ہیں، یہ بات کسی اور کتاب کو حاصل نہ تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پچھلی کتابوں اور ہدایتوں میں سے کسی کو بھی ہر پہلو سے کامل نہیں قرار دیا تھا۔ یہ صرف قرآن مجید ہے جس کے نازل ہونے پر اس نے یہ اعلان فرمایا کہ:-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ ۔ (مائدہ)

آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔

آیت کا منشا بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ نوعِ انسانی کی ابتداء سے جس ہدایتِ ربّانی کے نزول کا سلسلہ جاری چلا آرہا تھا، اور جو اپنی بنیادی تعلیمات میں ہمیشہ یکساں رہنے کے باوجود تفصیلات میں حسبِ ضرورت برابر بدلتی اور تمدنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ وسعت اختیار کرتی چلی جارہی تھی ـــــــ وہ اب ہر پہلو سے نقطۂ کمال کو پہنچ چکی ہے۔

(۳) قرآنی تعلیمات کا مزاج آفاقی اور بین الانسانی ہے، ان پر کسی خاص زمانے کی مخصوص ضرورتوں یا کسی خاص قوم کے مخصوص گروہی تقاضوں کی چھاپ نہیں ہے۔ وہ کسی قوم یا کسی نسل کو اپنے سامنے نہیں رکھتیں۔ بلکہ صرف 'انسان' اور انسانی فطرت کو سامنے رکھتی ہیں، اس لیے وہ ہر زمانے، ہر قوم، ہر نسل اور ہر خطّے کے لوگوں کے لیے یکساں طور پر موزوں اور مطابقِ ضرورت ہیں، جب کہ دوسری ہر کتاب کا حال یہ ہے کہ اس پر کسی خاص قوم کے مخصوص حالات کا پرتو ہر آنکھ کو دور ہی سے دکھائی دے جاتا ہے، اس لیے دوسری قوموں کے لیے اس کے موزوں ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن حکیم کی یہی صفتِ امتیاز ہے، جس کی بناء پر اس نے اپنے لائے ہوئے دین کو "دین فطرت" کہا ہے۔ (فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ـ (روم، ۳۰) اور دنیا کے سامنے صریح لفظوں میں یہ اعلان کر رکھا ہے کہ:-

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ

بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے

لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ ۔ (بنی اسرائیل ۔۹) زیادہ سیدھی ہے۔

(۴) یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد نزولِ ہدایت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کوئی اور کتاب یا کوئی اور صاحبِ کتاب (یعنی رسول) نہیں آئے گا۔ چنانچہ قرآن کا لانے والا پیغمبرؐ اس سلسلے میں یہ صراحت کر چکا ہے کہ:۔

اِنَّ الرِّسَالَۃَ وَالنُّبُوَّۃَ قَدِ	اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالت اور
انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ	نبوّت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ پس میرے
وَلَا نَبِیَّ :۔ (ترمذی، باب ذہاب النبوۃ)	بعد اب نہ کوئی رسول آئے گا۔ نہ کوئی نبیؐ۔

اور قرآن اپنے لانے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ بتاتا ہے کہ:۔

وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ	بلکہ وہ اللہ کا رسول، اور سب سے آخری
النَّبِیّٖنَ (احزاب)	نبی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بتانا بالکل غیر ضروری ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کتاب اور پیغمبر کا حال یہ نہ تھا۔

(۵) اس کتابِ الٰہی نے پچھلی ساری آسمانی کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے اور اَب کوئی دوسری کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے منظور شدہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب زندگی کا صحیح رویّہ اور فکر و عمل کا فلاح بخش طریقہ صرف اسی قرآن سے مل سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دوسری کتابوں کے کتابِ الٰہی ہونے سے انکار کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ جس معبودِ برحق اور فرمانروائے حقیقی نے اِن کتابوں کو نازل کیا تھا، اسی کا اب یہ فیصلہ ہے کہ ان کتابوں کو آئندہ سے دستور العمل اور آئینۂ حیات نہ بنایا جائے، اور صرف اس قرآن، میری اس آخری کتاب ہی کو یہ حیثیت دی جائے۔ اس فیصلۂ خداوندی کی رُو سے عرب و عجم، کالے اور گورے، ایشیائی اور یوروپی سب کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن ہی کی پیروی کریں، کیونکہ اب صرف اسی کی پیروی اللہ تعالیٰ کی بندگی قرار پاسکے گی اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ جن لفظوں میں مذکور ہے وہ یہ ہیں:۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ	بیشک (اب) اللہ کے نزدیک (مقبول و

الْاِسْلَامُ ۔ (آل عمران)	منظور شدہ) دین اسلام ہے۔
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۔ (آل عمران)	جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو پسند کرے گا تو (اللہ کی جناب میں) اس کی طرف سے اس دین کو ہرگز نہ قبول کیا جائیگا۔

یہاں اس وضاحت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ ان آیتوں میں، مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے جس "دین اسلام" کے متعلق یہ واضح اعلان کیا گیا ہے، وہ دین قرآنی ہی کا معروف نام ہے، اس لیے یہ کہنا کہ اسلام کے سوا اب دوسرا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول اور منظور شدہ نہیں، در اصل یہ کہنا ہے کہ اب قرآن کے سوا کوئی بھی دوسری کتاب برائے اتباع اللہ کے حضور قابل قبول باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس امر کی مزید وضاحت اور تائید اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لائے انہیں اس نے صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب، اللہ کا باغی اور عذاب کا سزاوار ٹھہرایا۔

(بینہ ا۔ نساء ۱۵۰، ۱۵۱)

(۶) قرآن پر ایمان لانا اور اس کی پیروی کرنا نجات کی شرط ہے۔ کوئی شخص بھی اس کا انکار کر کے آخرت میں نامرادی اور ہلاکت سے بچ نہیں سکتا۔ کسی بھی دوسری کتاب الٰہی کا اتباع انسان کو (بشرطیکہ اُسے قرآن کی دعوت پہنچ چکی ہو) نجات کا حق دار نہیں ٹھیرا سکتا۔ یہ حقیقت بھی مذکورہ بالا دونوں آیتوں کا بالکل لازمی تقاضا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" کے بعد والے الفاظ میں اس کی صراحت بھی کر دی گئی ہے، جو یہ ہے:۔

وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ	اور وہ آخرت میں گھاٹا اُٹھائے گا۔

(۷) اس وقت صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جو پوری طرح محفوظ رہ گئی ہے جس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ زیادتی ہوئی ہے، نہ کسی تغیر نے راہ پائی ہے، جس زبان میں، جن الفاظ میں، جن عبارتوں میں اور جس ترتیب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے پاس سے اُتری تھی جوں کی توں اسی شکل میں موجود ہے، اور ایسا اللہ تعالیٰ کے خصوصی اہتمام کی وجہ سے ہوا ہے،

جس کا اس نے اپنی اس کتاب کے اندر ہی اعلان فرما رکھا ہے:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (حجر)

یقیناً یہ قرآن، ہم نے نازل کیا ہے اور یقیناً ہم خود اسے محفوظ رکھنے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس اہتمام، اس اعلان اور فیصلے کو زمانہ بدل نہیں سکتا تھا، چنانچہ تاریخی طور بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہی ہے کہ قرآن میں کوئی ادنیٰ سا رد و بدل بھی نہیں ہو سکا ہے۔ (یہ بحث اپنے پورے دلائل اور پوری تفصیل کے ساتھ آگے آرہی ہے)۔

اس کے مقابلہ میں کو دوسری کتابوں کا حال یہ ہے کہ نہ تو اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے محفوظ رکھنے کا کوئی اعلان و اہتمام ہوا تھا، نہ وہ آج تاریخی تحقیق کی کسوٹی پر محفوظ باقی ثابت کی جاسکتی ہیں۔ حتیٰ کہ کسی کتاب کے علم بردار اور پیرو بھی اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنے کی گنجائش نہیں پاسکتے کہ یہ کتاب اسی زبان، ان ہی الفاظ اور اُن ہی عبارات میں ٹھیک ٹھیک محفوظ باقی چلی آئی ہے جن میں خدا کی طرف سے اتری تھی، اور اس میں کسی ایک فقرے، ایک جملے اور ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک قرآنی شہادت کا تعلق ہے، وہ بھی ہر اس کتاب کے بارے میں جس کا اس کے اندر تذکرہ آیا ہے، یہی ہے۔ چنانچہ تورات اور انجیل دونوں کے متعلق اس نے فرمایا ہے کہ ان کے علم بردار یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کے کچھ حصوں کو تو بدل ڈالا ہے (یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ، (مائدہ) اور کچھ باتوں کو فراموش کر کے رکھ دیا ہے۔ (وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ۔ (مائدہ)

قرآن مجید کے اسی شرفِ خاص کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جس زبان میں اُترا ہے وہ ایک زندہ زبان ہے۔ آج ایشیا اور افریقہ کے بیسیوں ممالک کے رہنے والے کروڑوں افراد اسے بولتے ہیں، اور اس کے جاننے اور سمجھنے والوں کی تعداد تو اور بھی زیادہ ہے دوسرے لفظوں میں وہ ایک علمی، عوامی اور بین الاقوامی زبان ہے اس کے بالمقابل وہ ساری زبانیں جن میں دوسری کتابیں نازل ہوئی تھیں، عوامی زندگی سے یکسر دور ہو چکی ہیں، اور ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کو زندہ زبان کہا جاسکے۔ کسی کتاب کی

اصل زبان، کا ایک زندہ زبان کے طور پر باقی رہنا اس کے محفوظ رہنے کے لیے جس قدر ضروری ہے، اس کے لیے کسی وضاحت یا دلیل کی ضرورت نہیں۔

(۸) اللہ تعالیٰ کی بنیادی ہدایت اور اس کا اصل دین ہمیشہ سے کیا رہا ہے؟ اس بات کے فیصلے کا غیر مشروط حق صرف قرآن کو حاصل ہے کیونکہ دوسری کوئی اور کتاب ایسی موجود ہی نہیں جو اپنی حقیقی صورت میں پوری طرح محفوظ باقی رہ گئی ہو۔ اس لیے خاص اور بے آمیز ہدایت کا کہیں اور پایا جانا بھی ممکن نہیں۔ اس طرح حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ قرآن کی تعلیمات اپنی حقیقی شکل میں جوں کی توں محفوظ موجود ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ اب دوسری کتابوں کی حقیقی تعلیمات کا سراغ بھی خود اُن کے اپنے صفحات میں نہیں بلکہ قرآن ہی کے صفحات میں مل سکتا ہے۔ دوسری کتابوں کے اندر ردّوبدل ہو جانے کے پیش نظر یہ عقل کا صریح تقاضہ تو ہے ہی اس پر اللہ تعالیٰ کی واضح سند بھی موجود ہے۔ اس نے فرمایا ہے :-

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	اے محمد! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب،
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	حق کے ساتھ اُتاری ہے، جب کہ وہ
مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ الخ	اپنے سے پہلے والی کتابوں (کی پیشینگوئیوں)
(مائدہ، ۴۸)	کے عین مطابق اور ان کی 'مھیمن' بھی ہے۔

'مھیمن'، کے معنی ہیں نگراں اور محافظ۔ قرآن مجید پچھلی کتابوں کا نگراں اور محافظ ہے، یعنی ان کے اصل پیغام پر آمیزشوں اور تبدیلیوں کے جو حجابات ڈال دیے گئے ہیں انہیں ہٹا دیتا ہے، اور اس طرح ان کی اصل تعلیمات کا تعین کر دیتا ہے۔ اِس ارشادِ الٰہی کا مطلب صاف صاف یہ ہوا کہ اگر اس وقت کوئی یہ جاننا چاہے کہ فلاں کتاب کی اصل تعلیم کیا تھی، تو اس کے لیے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ وہ خود اس کتاب کی ورق گردانی کرنے کے بجائے قرآن کو دیکھے، کیونکہ اُن کی اصل بنیادی تعلیمات بھی صرف یہیں مل سکتی ہیں۔ پھر اتنا ہی نہیں اس صورتِ واقعی کے تقاضے تو اس سے بھی آگے تک جاتے ہیں، اور وہ یہ کہ اب ان

کتابوں کا بھی صحیح اور واقعی اتباع قرآن مجید ہی کا اتباع کر کے ہو سکتا ہے۔

(۹) قرآن مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کا ثبوت بالفعل موجود حقیقتوں اور ہر آن تازہ شہادتوں پر قائم ہے، ماضی کے کچھ واقعات کا اور نقل و روایت کا محتاج نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے کتاب الٰہی ہونے کا ثبوت بھی خود ہی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی داخلی صفات اور اپنے ظاہری نتائج، غرض ہر پہلو سے ایک معجزہ ہے، ہر صاحب نظر کو دکھائی دے جانے والا معجزہ۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی حق پسند اس کی اِن صفتوں اور عملی برکتوں کا دل کی آنکھیں کھول کر جائزہ لے اور اس کے کانوں میں یہ الفاظ گونج نہ اٹھیں کہ 'بخدا یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا' (جیسا کہ پچھلی بحث سے پوری طرح آشکارا ہو چکا ہے) اس صورتِ واقعی کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن جہاں بھی موجود ہوگا، جس جگہ بھی پیش کیا جائے گا، جس وقت اور جس مقام پر بھی پڑھا جائے گا وہاں اس کی حقانیت کی دلیل بھی موجود ہوگی، اور کسی وقت بھی بالواسطہ اور نظروں سے اوجھل دلائل کا قطعاً محتاج نہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کتاب کا وجود اور اس کا پیغام ہی زندہ، محفوظ اور ابدی نہیں، بلکہ اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت بھی زندہ، محفوظ اور ابدی ہے۔ جب کہ دوسری کتابوں کا حال اس سے بالکل مختلف ہے کیونکہ ان کی صداقت کا ثبوت خود ان کے اپنے اندر موجود نہیں کہ آنکھوں کے سامنے پا لیا جائے، بلکہ ماضی کی تاریخ میں ہے، جسے دیکھ سکنے کے لیے پیچھے دور تک مڑنا پڑتا ہے۔ توراۃ اللہ کی کتاب اس وقت ثابت ہوتی ہے جب پہلے اس کے پیش کرنے والی شخصیت کو 'عصا' اور 'ید بیضا' جیسے حسّی اور وقتی معجزوں کی بنا پر رسولِ خدا تسلیم کیا جا چکا ہو۔ انجیل کی صداقت اس وقت تک زیرِ بحث ہی رہے گی جب تک کہ مُردوں کو زندہ، کوڑھیوں کو تندرست اور اندھوں کو بینا کر دینے کے دو ہزار سالہ قدیم واقعات حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا فرستادہ ثابت نہ کر دیں۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی صداقت کا یہ ثبوت ان لوگوں کے لیے تو ضرور براہِ راست ثبوت تھا، جنہوں نے ان معجزوں کو بذاتِ خود دیکھا تھا، لیکن بعد کے لوگوں کے لیے اس کی حیثیت یہ نہیں رہ گئی ہے، بلکہ بالواسطہ ثبوت کی ہو چکی ہے، آدمی پہلے نقل و روایت کے اس سلسلے کا قابلِ اعتماد ہونا جانچے پرکھے گا جس کے ذریعہ ان معجزات کی خبر اس تک پہنچی ہے، پھر اس تحقیق کے نتیجہ میں اگر اُسے

اطمینان ہو گیا کہ یہ سلسلہ اور خبر کا یہ ذریعہ اعتماد کے قابل ہے تب کہیں جا کر ان کتابوں کا اللہ کی طرف سے ہونا اس کے لیے قابلِ تسلیم ہو سکے گا۔ لیکن قرآن مجید کی صداقت کا ثبوت اس بات پر ہرگز موقوف نہیں ہے کہ اس کے پیش کرنے والے نے کچھ حسّی اور وقتی معجزات دکھا کر اپنا اللہ کی طرف سے مبعوث ہونا ثابت کر دیا تھا، بلکہ وہ اپنا ثبوت اور اپنی دلیل آپ ہے، کیونکہ وہ بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ حسّی اور وقتی معجزہ نہیں، جو بعد کے لوگوں کے لیے محض ایک خبر بن کر رہ گیا ہو۔ بلکہ خالص عقلی معجزہ جو ہر زمانے میں اور ہر شخص کے سامنے ایک زندہ حقیقت بنا موجود ہے، اور نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد کو براہِ راست دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صورتِ واقعی کی وضاحت کی تھی جب یہ فرمایا تھا کہ:۔

مَا مِنَ الْاَنْبِيَآءِ نَبِيٌّ اِلَّآ اُعْطِيَ مِنَ الْاٰيَاتِ مَا مِثْلُهٗ اٰمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ اُوْتِيْتُ وَحْيًا اَوْحَى اللّٰهُ اِلَيَّ ۔	ہر نبی کو اتنے اور ایسے معجزے دیئے گئے جن کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لا سکے ہوں، اور مجھے جو اہم ترین معجزہ عطا کیا گیا ہے وہ تو وہی کلامِ الٰہی (یعنی قرآن) ہے جس کی اللہ نے مجھ پر وحی فرمائی ہے۔
(بخاری۔ کتاب فضائل القرآن)	

اپنے اس ارشاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم ہی کو اپنا "کل معجزہ" قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کو کئی حسّی معجزے بھی عطا ہوئے تھے۔ اس لیے آپ کے فرمانے کا منشا یہ ہوا کہ آپ کا حقیقی اور سب سے بڑا معجزہ صرف قرآن تھا، اور اس کے مقابلے میں دوسرے معجزوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ خود قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کی نشان دہی فرما رکھی ہے، چنانچہ قریش کی طرف سے حسّی معجزوں کا جو مطالبہ بار بار ہوا کرتا تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ:۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ	کیا (یہ لوگ معجزے مانگتے ہیں) اور ان کے لیے معجزے کے طور پر یہ بات کافی نہیں ہے

يَتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ (عنکبوت، ۵۱)

کہ (اے نبی!) ہم نے تم پر یہ کتاب نازل فرما رکھی ہے، جو اُنہیں پڑھ کر سنائی جا رہی ہے؟

یہ ہیں قرآن مجید کے وہ مخصوص امتیازات اور اس کی فضیلتیں، جو اُسے دوسری کتابوں کے مقابلہ میں حاصل ہیں۔ غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ الگ الگ اور باہم کوئی ربط و تعلق نہ رکھنے والے اوصاف نہیں ہیں، بلکہ ان سب میں ایک گہرا فطری ربط کارفرما ہے، اور یہ سب دراصل ایک ہی عظیم حقیقت کے مختلف تقاضے ہیں۔ جو کتاب پوری نوعِ انسانی کے لیے آئی ہو اور اللہ کا آخری ہدایت نامہ ہو، قطعاً ضروری تھا کہ وہ ہر پہلو سے کامل بھی ہو، وہ خالص اصولی اور .... بین الانسانی مزاج کی مالک بھی ہو، اس کے بعد ساری پچھلی کتابیں منسوخ بھی قرار دے دی جائیں آخرت کی نجات کے لیے اس کی پیروی کو لازمی بھی ٹھہرا دیا جائے، وہ اس وقت تک جب تک کہ اس زمین پر انسان موجود ہے پوری طرح محفوظ بھی رکھی جائے، اور سب سے آخری بات یہ کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے کا اصل ثبوت بھی راست قسم اور مستقل نوعیت کا ہو تاکہ جب بھی اس اہم ترین دعوے کو کوئی سنجیدگی سے پرکھنا چاہے تو وہ اپنے لیے تشفّی اور طمانیت کا پورا سامان اپنے سامنے ہی موجود پا لے۔

مطالعۂ قرآن کی ذمّہ داری

کوئی شک نہیں کہ اوپر کی بحثیں نزولِ قرآن کو دنیا کا سب سے اہم واقعہ، اور دعوتِ قرآنی کو انسانیت کا سب سے اہم مسئلہ بنا دیتی ہیں، وہ ایک ایک فردِ انسانی سے مطالبہ کرتی ہیں کہ قرآن کے معاملہ میں بے پروائی ہرگز نہ اختیار کرے، اور اس کا مطالعہ اپنی سب سے اہم اور سب سے مقدم ذمہ داری باور کرے۔ جو لوگ 'مسلمان' ہیں اور قرآن کی اس حیثیت کو تسلیم کر چکے ہیں، اُن کی حد تک اس ذمہ داری کی ادائی تو یہ ہے کہ وہ اس کے احکام و ہدایات کو سمجھیں، نظر میں رکھیں، اور ان کی سچے دل سے تعمیل کریں۔ اور جو مسلمان نہیں ہیں اور قرآن کے ماننے والوں کے حلقہ سے باہر ہیں، ان کے لیے اس ذمہ داری کا مطلب بنیادی طور پر یہ ہے کہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ

اس کی حیثیت کے بارے میں تحقیق کریں۔ کسی کے غیر مسلم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قرآن سے کوئی غرض نہ رکھے۔ یہ معنی ہو سکتے تھے اگر قرآن اپنی حیثیت صرف ایک عام کتاب الٰہی کی قرار دیتا۔ کیونکہ ایسی حالت میں دوسری آسمانی کتابوں کے پیروؤں کے لیے ہرگز ہرگز ضروری نہ ہوتا کہ وہ اس کے بارے میں تحقیق حال کی کوئی ذمّہ داری اٹھائیں، لیکن جب وہ اپنی حیثیت یہ بتاتا ہے کہ وہ ایسی کتاب الٰہی ہے جو ساری دنیا کے لیے نازل ہوئی ہے، جس کے بعد دوسری تمام کتابیں اللہ تعالیٰ نے منسوخ قرار دے دی ہیں، اور اب دنیا میں اللہ کی اطاعت و بندگی کا، اور آخرت میں فلاح و نجات کا انحصار تمام تر اسی کی پیروی پر ہے تو پھر معاملہ بڑا سنجیدہ بن جاتا ہے، اور کسی غیر مسلم کے لیے اس بات کی کوئی وجہِ جواز باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ اس قرآن پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہوا بے پروائی کے ساتھ آگے بڑھ جائے۔ اور اس کے دعوے کو کوئی اہمیت نہ دے۔ ایسا کر کے وہ اپنے بہترین مفاد کے ساتھ کھلا ہوا ظلم کرے گا، اور انتہائی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دے گا۔ کیونکہ وہ زندگی کے جس سفر میں مصروف ہے، اس کے بارے میں اُسے مطلع کیا جا رہا ہے کہ یہ سفر اُسے کامیابی کی منزل پر اسی وقت پہنچا سکتا ہے جب کہ وہ قرآن کی رہنمائی قبول کر چکا ہو۔..... لیکن وہ ہے کہ اس آواز کو سننے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کی طرف متوجہ تک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کا یہ اعلان اس کے نزدیک محض ایک دعویٰ ہے، اور ضروری نہیں کہ ہر دعویٰ حقیقت کے مطابق ہی ہو، لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں کہ ہر دعویٰ حقیقت کے خلاف ہی ہو۔ اس لیے کسی سنجیدہ دعوے کے متعلق جب تک کسی ذمہ دارانہ تحقیق اسے اس یقین تک نہ پہونچا دے کہ وہ غلط ہے، اس وقت تک وہ اگر اُس کو سچّا نہیں کہہ سکتا تو جھوٹا بھی نہیں کہہ سکتا۔ قرآن کے اس دعوے کا کم سے کم ایک سنجیدہ اور قابل غور دعویٰ ہونا تو اسی طرح روشن ہے جس طرح دوپہر کا سورج روشن ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی کے سامنے اس طرح کے علمی اور عقلی دلائل نہیں آئے ہیں جیسے قرآن کی صداقت پر پچھلے صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں، تو کیا اس کی آنکھوں کو یہ عملی دلیل بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے کہ کروڑوں انسان قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں اور جب بھی اسے تسلیم کرنے کا حق ادا کیا گیا ہے فرد کی، معاشرے کی، ریاست کی، غرض ہر طرح کی زندگی میں نیکی اور

خدا ترسی کی بہاریں آگئی ہیں؟ یہ تو سطح پر کے واقعات ہیں، جن کے جاننے کے لیے کسی کاوش کی بھی ضرورت نہیں۔ اس لیے یہ بڑی ہٹ دھرمی اور انتہائی نامعقولیت کا مظاہرہ ہوگا اگر کوئی شخص قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کے دعوے کو۔۔۔۔ سنجیدہ اور قابلِ غور۔۔۔ بھی نہ سمجھے۔ غرض یہ دعویٰ قطعًا اور بداہتًہ ایک سنجیدہ اور قابلِ غور دعویٰ ہے اور کسی دعوے کے سنجیدہ اور قابلِ غور ہونے کا مسلّمہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابتداءً اور تحقیق سے پہلے اس کے صحیح ہونے کا بھی ویسا ہی امکان ہے، جیساکہ اس کے غلط ہونے کا ہے، اس لیے انصاف کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کو ہر غیر مسلم ابتداءً یہی حیثیت دے، اور پھر اس کی صحت کو جانچنے اور حقیقت معلوم کرنے کی پوری پوری کوشش کرے، اور لازمًا کرے۔ کیونکہ اگر یہ دعویٰ صحیح نکلا، جو بہرحال ممکن ہے، تو قرآن اس کی سب سے بڑی دولت بن جائے گا، ایسی دولت جسے نہ پاکر اس کی ابدی زندگی ابدی مصیبت کی نذر ہو جانے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی دانشمند آدمی کسی ایسی چیز کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا جس کا اُس کی سب سے قیمتی دولت اور ابدی سامانِ راحت ہونے کا پچاس فی صد امکان تحقیقِ حال سے پہلے بھی موجود ہو، اور تحقیق کے بعد سو فی صد یقین سے بھی لازمًا بدل سکتا ہو۔

نزول اور تدوین

تاریخ نزول

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ قرآن کا آغاز رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا، چنانچہ وہ خود صراحت کرتا ہے کہ:۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ الخ (بقرہ، ۱۸۵)	رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کا نزول (شروع) ہوا۔

شمسی حساب سے یہ ماہِ اگست ۶۱۰ء کا زمانہ تھا۔ سب سے پہلی وحی جس وقت نازل ہوئی، آپ بیرونِ مکّہ کی پہاڑیوں میں ایک غار، غارِ حراء کے اندر محوِ غور وفکر تھے۔ سلسلۂ وحی کی یہ ابتدائی کڑی سورۂ علق کی حسبِ ذیل پانچ آیتوں پر مشتمل تھی:۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ۝ (پ ۳۰)	(اے محمدؐ) پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے، پڑھ، اور تیرا رب بڑا صاحب کرم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، آدمی کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔

اُس وقت آپ کی عمر شمسی حساب سے تقریباً ۳۹ سال ساڑھے تین ماہ، اور قمری مہینے کے حساب سے ۴۰ سال ساڑھے چھ ماہ تھی۔ وحی کا یہ مبارک سلسلہ تیئیس برس کی

طویل مدت تک جاری رہا۔ آخری وحی سورۂ توبہ کی آخری دو آیتوں پر مشتمل تھی[۱]۔ اور ۶۳۳ء میں آپ کی وفات سے کچھ دن پیشتر نازل ہوئی تھی۔ اس مدت میں سے نصف سے زائد یعنی تقریباً ساڑھے بارہ سال تو مکہ میں گزرے اور باقی دس برس مدینے میں۔ مکّی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں اُن کی تعداد (۹۰) ہے، جو مقدار میں پورے قرآن کا تقریباً دو تہائی حصّہ ہیں۔ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی تعداد (۲۴) ہے۔ جو تقریباً ایک تہائی قرآن ہیں۔ اس طرح کل سورتوں کی تعداد (۱۱۴) ہے۔ ان (۱۱۴) سورتوں کی کل آیات اور کلمات اور حروف کو اگر شمار کیا جائے تو اُن کی تعداد بالترتیب، آیات (۶۲۳۶) کلمات (۷۷۹۳۳) اور تین لاکھ تیئیس ہزار پندرہ (۳۲۳۰۱۵) حروف ہوگی۔

کیفیتِ نزول

مجرد یہ بات، کہ پورا قرآن تیئیس سال کی لمبی مدت میں نازل ہوا ہے، نہ تو اس خیال اور قیاس کی کوئی گنجائش باقی رہنے دیتی کہ وہ بیک وقت پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دیا گیا ہوگا، اور نہ اس خیال کی کہ اس کی حیثیت بھی عام تصنیفات اور کتابوں کی سی ہوگی، جن کے اندر خالص علمی اور فنی انداز میں ایک متعیّنہ موضوع کے متعلق بحثیں ہوا کرتی ہیں، چنانچہ اصل صورتِ واقعہ کی وضاحت وہ خود اس طرح کرتا ہے:-

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۔ كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۔ (الفرقان ۳۲)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر پورا قرآن بیک دفعہ کیوں نہیں اتار دیا گیا؟ تو ہم اسے اسی طرح (تھوڑا تھوڑا) کر کے اُتار رہے ہیں۔ تاکہ اس کے ذریعہ تمہارے قلب کو مضبوط کرتے رہیں۔ اور ہم نے اُسے پورے اہتمام کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر سنایا ہے۔

---

[۱] اور ایک دوسری روایت کے مطابق آخری وحی سورۂ نساء کی آخری آیت پر مشتمل تھی۔ اور تیسری روایت کے مطابق سورۂ بقر کی آیتِ ربٰوا پر۔

غرض قرآن مجید پورا کا پورا ایک ہی دفعہ میں نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ کبھی چند آیتیں ہی اُتریں، تو کبھی پوری ایک سورۃ کا نزول ہوا۔ دو وحیوں میں کبھی بہت معمولی وقفہ ہوا، تو کبھی ہفتوں اور مہینوں تک سکوت رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی ہدایت نامہ بھی ہے، اور اس کا نزول ایک دعوت کے ساتھ ہوا ہے، ایسی دعوت کے ساتھ جو عملی اور ارتقائی دعوت تھی، جو ایک نقطہ سے شروع ہوئی، آگے بڑھی، بڑھتی رہی اور پھر مختلف حالات و مراحل سے گزرتی ہوئی کامرانی کی منزل تک پہنچی تھی، ایسی دعوت کا فطری تقاضا یہی تھا کہ قرآن ٹھیر ٹھیر کر اُترتا، اور وحیِ الٰہی دعوت کے حالات اور اس کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ہی نازل ہوتی۔

اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے مناسب ہو گا کہ اس دعوت کے مختصر حالات اور اس کی عملی شکل کو بھی سامنے رکھ لیا جائے۔

صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی اپنی نبوّت کا اعلان کیا اور اللہ واحد کی لاشریک بندگی کی دعوت پیش کی، مکّے کے مشرک اور بُت پرست معاشرے میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا، اور فضا انکار و اختلاف ہی نہیں بلکہ غیظ و غضب کے شعلوں سے تمتما اٹھی۔ صرف چند ہی لوگ تھے جو دعوت کی اس ابتدائی منادی کے وقت ٹھنڈے دل سے اس پر غور کر سکے، اور اس کے نتیجے میں اس پر ایمان لانے کی توفیق پا سکے۔ ورنہ عام ردِّ عمل اختلاف و عناد ہی کا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ ردِّ عمل نہ تو خلافِ توقع تھا اور نہ اس کی بنا پر داعیٔ قرآن کے لیے مرعوب ہو کر خاموشی اختیار کر لینے کا کوئی سوال تھا۔ اس لیے تمام تر مخالفتوں اور ناسازگاریوں کے باوجود وہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائی میں برابر منہمک رہا اور سُننے سمجھنے پر نہ آمادہ ہونے والوں کو بھی اپنی بات سُنانا اور سمجھا دینے کی ہر ممکن تدبیر اور کوشش انجام دیتا رہا۔ جس کے نتیجہ میں لوگ ایک ایک دو دو کر کے برابر دائرۂ اسلام میں آتے رہے۔ لیکن جس رفتار سے یہ دائرہ وسیع ہو رہا تھا، اسی رفتار سے مخالفت اور غیظ و غضب کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی، اور وہ جلد ہی ظلم و بربریت کی شکل اختیار کر گئی۔ حتیٰ کہ مسلمان ہونا مصیبتوں کو بُلا وا دینے کے ہم معنی ہو گیا۔ دعوت کے

مخالفین دولت، طاقت، اثر، اقتدار اور کثرتِ تعداد سبھی کچھ رکھتے تھے، اور اُن کے مقابلے میں اہلِ ایمان کچھ بھی نہ تھے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ بظاہر اسباب ہر حیثیت سے طاقت اور ناطاقتی کا مقابلہ تھا۔ ایسی حالت میں نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ پر جو کچھ گزر سکتی تھی وہ کسی اظہار و بیان کی محتاج نہیں۔ علی الاعلان خدا کو ایک کہنے اور نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

دعوت ان حالات سے کشمکش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ دس بارہ سال گزرتے گزرتے ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گئی۔ قریش کے سارے قبیلوں نے اتفاقِ رائے سے طے کیا کہ اب اُسے مزید مہلت بالکل نہ دی جائے۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے ہمیشہ کے لیے اس 'فتنہ' کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جب بات اس حد کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اور اس کے اہلِ ایمان ساتھیوں کو ہدایت فرمادی کہ مکّہ چھوڑ دیں، اور مدینہ چلے جائیں، جو مکّہ کے بعد پورے ملک میں تنہا ایسا مقام تھا جہاں اس وقت تک دعوت پہنچ چکی تھی اور ایک قابلِ لحاظ تعداد میں لوگ اس پر ایمان بھی لا چکے تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ چلے گئے اور اب سے یہی مقام دعوت کا مرکز قرار پا گیا۔ یہاں کے حالات ایسے تھے کہ اہلِ ایمان مکّے کی طرح مظلوم و مقہور نہ رہے، بلکہ اُنہیں ضروری حد تک ایک آزاد ماحول میسّر آگیا جس میں انہیں اپنے معاملاتِ زندگی کا پورا پورا اختیار حاصل تھا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایک طرح کا ان کا اپنا آزاد اسٹیٹ وجود میں آگیا۔ اس کے علاوہ خود دعوت کا دائرۂ خطاب بھی زیادہ وسیع ہو گیا۔ مکّے میں یہ خطاب اہلِ شرک تک محدود تھا، لیکن مدینے میں اہلِ شرک کے ساتھ ساتھ اہلِ کتاب بھی اس کے حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ کیونکہ اس جگہ یہ لوگ بھی کثیر تعداد میں آباد تھے۔ اس لیے عالمی دعوت ہونے کی وجہ سے ضروری تھا کہ اُسے اُن تک بھی پہنچایا جائے۔ ابتدائی ایّام میں دعوتی جد و جہد کا نتیجہ حسبِ توقع یہاں بھی انکار اور اقرار، مخالفت اور قبول دونوں ہی شکلوں میں ظاہر ہوا۔ کچھ لوگ ایمان لائے، اکثریت نے مخالفت کی، خصوصاً یہودی آبادی کی نوننانوے فیصد اکثریت آخر تک مخالف ہی رہی۔ لیکن یہاں کفر اور اسلام کی طاقتوں کا تناسب چونکہ وہ نہیں تھا جو مکّے میں رہ چکا تھا، اس لیے یہ

مخالفتیں بھی ظلم اور ایذا رسانی کا وہ رنگ اختیار نہ کرسکیں جس سے مکّہ میں سابقہ پیش آچکا تھا یہاں سماجی اور سیاسی بالاتری اسلام کو حاصل تھی، اس لیے ان مخالفتوں نے بھی کھلے تصادم کے بجائے خفیہ تدبیروں اور سازشوں کی پالیسی اختیار کرلی۔ اس پالیسی کے تحت مسلم معاشرے میں اسلام کے بہت سے جھوٹے مدعی بھی گھس آئے جنھیں منافق کہتے ہیں۔ اس طرح جہاں مکّے میں دعوتِ حق کے خلاف ایک محاذ تھا۔ یہاں دو محاذ وجود میں آگئے۔ ایک تو اس کے کھلے ہوئے دشمنوں یعنی کفار و مشرکین کا، دوسرا اس کے چھپے ہوئے دشمنوں یعنی منافقوں کا۔ یہ آستینوں کے سانپ دعوت کے لیے ایک نئی مصیبت اور ایک اہم مسئلہ تھے۔ کیونکہ انھوں نے اسلام کی عمارت کو ڈھا دینے کے لیے خود اسی کو اپنی کمین گاہ بنالیا تھا۔ ادھر ہجرت کے بعد اہلِ مکّہ نے بھی ''خس کم جہاں پاک'' کہہ کر اطمینان کا سانس نہیں لے لیا تھا، بلکہ اپنی خواہشوں، تدبیروں اور کوششوں کے علی الرغم دعوت کو یوں پھولتے پھلتے دیکھ کر وہ اب اور زیادہ پیچ و تاب کھانے لگے تھے، اور مسلح اقدامات کے ذریعہ اُسے نیست و نابود کر ڈالنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں نے اُن سے خفیہ رابطہ قائم کیا اور انہیں شہ پر شہ دینے لگے۔ چنانچہ مسلمانوں کو مدینہ آئے ابھی پورے دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ انھوں نے زبردست تیاریوں سے اُن کے خلاف جنگی کارروائی شروع کردی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں نبی اور اس کے ساتھیوں کو یہاں بھی سکون میسر نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ برسوں صورتِ حال یہ رہی کہ مکّے کے مشرکین رہ رہ کر اُن پر حملے کر رہے ہیں، منافق اندر سے خطرہ بنے ہوئے ہیں، یہودی نظریاتی فتنے اٹھا رہے ہیں اور سیاسی سازشیں کر رہے ہیں۔ اس طرح دعوت اگرچہ جڑ پکڑ چکی اور ایک طاقت بن کر قدم آگے بڑھا رہی ہے، مگر مخالفتوں کا ہجوم بھی گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی جارہا ہے۔ بالآخر یہ کشمکش دعوت کے حق میں اپنا واضح فیصلہ دینے لگتی ہے، مخالف طاقتیں مرعوب ہونے لگتی ہیں۔ اصل دشمن یعنی اہلِ مکّہ بھی جنگ اور حالتِ جنگ کی جگہ صلح کا معاہدہ کرلینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لیکن چونکہ سینے کی آگ بدستور بھڑکی جارہی ہے اس لیے موقع پاکر معاہدہ کی خلاف ورزیاں کر بیٹھتے ہیں۔ جس کے بعد داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے

ہزاروں ساتھیوں کے ہمراہ مکّہ کا رُخ کر لیتے ہیں، دشمنوں کو اب مقابلے میں آنے کی ہمت نہیں ہوتی، اس لیے ایک تیر چلے بغیر ہی آپؐ شہر کے اندر فاتحانہ داخل ہو جاتے ہیں، اور دعوتِ قرآنی کے اصل مرکز، کعبہ، کو شرک کے ایک ایک نشان سے پاک کر لیتے ہیں۔ اس کھلی ہوئی اور مکمل فتح کے بعد پورے عرب میں اسلام ایک سیلاب بن کر چھا جاتا ہے۔ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگتے ہیں، اور اب پورے ملک میں اسلام ہی اصل طاقت بن جاتا ہے۔ مسلم معاشرہ اپنے نشوونما کے سارے فطری مرحلوں سے گزرتا ہوا ہر حیثیت سے ایک مکمل معاشرہ بن چکا ہوتا ہے اور اس بات کے لیے بالکل آزاد و خود مختار ہوتا ہے کہ اپنی پوری زندگی جس طرح چاہے بسر کرے، جس آئین اور جن قوانین پر چاہے عمل کرے، کوئی بیرونی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل باقی نہیں رہ جاتی۔ اس طرح یہ دعوت عرب میں اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

یہ ہے اس دعوت کے سفرِ ارتقا کی مختصر تاریخ۔ جو قرآن اس طرح کی دعوت کے ساتھ اور اس کا عملی رہنما بن کر نازل ہوا تھا، اس کا بیک دفعہ نازل ہو جانا بداہتہً ناممکن تھا۔ اس کے نازل کیے جانے کی شکل تو قدرتی طور پر اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ یہ نزول اس وقت سے شروع ہو جس وقت یہ دعوت شروع ہوئی تھی، اور اس وقت ختم ہو جس وقت یہ دعوت اپنے نقطۂ کمال کو پہنچی تھی، اور اس دوران اس کے مختلف اجزاء وقفہ وقفہ سے اس ترتیب کے ساتھ نازل ہوتے رہیں جس کا دعوت کے حالات اور اس کی ضرورتیں تقاضا کرتی جا رہی تھیں۔ یعنی ابتداء میں دعوت کی صرف بنیادی باتیں پیش فرمائی جائیں، اُن کے برحق ہونے کے دلائل دیے جائیں اور اُن پر ایمان لانے یا نہ لانے کے نتائج واضح کیے جائیں۔ پھر نزولِ وحی کی رفتار بھی ابھی تیز نہ ہو۔ تاکہ لوگوں کو اس دعوت کے بارے میں پوری طرح غور کر لینے کا موقع مل جائے۔ اس کے بعد ایمان لانے کے مطالبے میں شدت پیدا ہو۔ اتمامِ حجت کے تمام ضروری تقاضے پورے کیے جائیں، اور جھنجھوڑ دینے والی، اثر سے بھری ہوئی اور دلائل سے آراستہ وحیوں کا ایک لمبا سلسلہ جاری رہے۔ دوسری طرف اہلِ ایمان کو ابھی تک صرف اصولِ دین ہی کی تلقین کرنے پر اکتفا کیا جائے،

انہیں اپنی ایمانی صفات کو پختہ سے پختہ تر بنانے، حق پر ثابت قدم رہنے اور اللہ کی راہ میں مظالم برداشت کرنے کی وصیتیں کی جائیں اور حسنِ انجام کی بشارتوں کے ذریعہ پیہم تسلیاں دی جائیں پھر ہجرت کا وقت قریب آجانے پر انہیں گھر بار، مال و اسباب، اعزہ و اقارب سب کچھ چھوڑ دینے اور ان سارے دنیوی علائق کی قربانیاں دے سکنے کے لیے تیار کیا جائے اور اس غرض سے اپنے پروردگار پر کامل بھروسہ رکھنے کی ہدایتیں دی جائیں۔ مدینہ پہنچنے کے بعد ایک[1] طرف تو اہل ایمان کے لیے تفصیلی احکامِ دین کا نزول شروع ہو، انہیں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق شرعی ضابطے دیے جانے لگیں، ان کے اندر مسلح حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تن من دھن نثار کر دینے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ دوسری[2] طرف منافقوں کو زجر و ملامت کی جائے۔ انہیں راست بازی کا رویّہ اختیار کرنے کی تنبیہیں فرمائی جائیں، اُن کے فتنوں سے مخلص مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا ہے۔ تیسری[3] طرف مشرکوں، یہودیوں، عیسائیوں، غرض ہر ملّت کے غیر مسلموں کو دینِ حق کی تبلیغ و تفہیم کا سلسلہ بدستور جاری رہے، اور نہ صرف مدینہ، اطرافِ مدینہ، اور عرب کے غیر مسلموں کو، بلکہ حالات کے مزید ساز گار، اور دعوت کے مزید استوار ہو جانے پر بیرونِ عرب کی قوموں کو بھی دعوتِ اسلام پہنچانے کی ابتدا کر دی جائے پھر آخری دنوں میں، جب کہ دعوت کفر کی طاقت کو توڑ کر پورے ملک میں بالاتری حاصل کر چکے، اہلِ ایمان کے لیے تفصیلی احکام تیزی سے نازل کر دیے جائیں، اور دعوت کے پایۂ تکمیل تک پہنچتے پہنچتے ان احکام کو بھی مکمل کر کے قرآن کی تکمیل کر دی جائے۔

جو شخص بھی قرآنِ مجید کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گا، وہ صاف محسوس کر لے گا کہ اس کا نزول ٹھیک اسی طرح ہوا ہے۔ چنانچہ حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰہَ تَابَعَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ	اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی وفات کا
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	وقت قریب آنے پر پیہم وحی بھیجی، یہاں
قَبْلَ وَفَاتِہٖ حَتّٰی تَوَفَّاہُ	تک کہ جن دنوں اس نے آپؐ کو وفات دی
اَکْثَرُ مَا کَانَ الْوَحْیُ۔ (بخاری کتاب فضائل القرآن)	ان دنوں وحی کا نزول سب سے زیادہ رہا۔

تو یہ بھی دراصل نزولِ قرآن کی اسی کیفیت اور اس کی حکمت کی ایک وضاحت ہے۔

وفاتِ رسول کا وقت قریب آنے کا مطلب تھا، دعوت کا پایۂ تکمیل کو پہنچ جانا، اور اسلام کے اقتدار کا مستحکم ہو جانا۔ اور ظاہر ہے کہ شریعت کے اکثر و بیشتر تفصیلی احکام کے نازل ہونے کا فطری موقع اور مناسب وقت وہی تھا جب اسلام کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا اور اہلِ اسلام اُن پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہو سکنے کی پوزیشن میں آ چکے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے قدرتی طور پر یہ احکام رُکے رہے، اور اس موقع اور وقت کے انتظار میں تھے، پھر جب یہ وقت آ گیا تو وہ تیزی سے نازل ہونے لگے، اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر وحیوں کا تانتا بندھ گیا۔

تدوینِ قرآن

قرآن جس ترتیب سے نازل ہوا تھا، اسی ترتیب سے مدون نہیں فرمایا گیا۔ اس کی کچھ سورتیں تو ایسی ضرور ہیں جو پوری کی پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی تھیں، اس لیے ان کی آیتوں کی تدوینی ترتیب بھی قدرتی طور پر اپنی نزولی ترتیب کے مطابق ہی ہے، لیکن اکثر و بیشتر سورتوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بیک دفعہ نازل ہونے کے بجائے ان کے مختلف اجزاء مختلف اوقات میں نازل ہوئے تھے۔ سورۃ کا اگر ایک ٹکڑا آج نازل ہوا تو دوسرا مہینوں بعد، اور تیسرا سالوں بعد۔ ابتدائی آیتیں اگر مکّی ہیں تو آخری مَدنی۔ سورۃ کے وہ اجزاء جو اس وقت اس کے آخری حصّے میں نظر آتے ہیں، نزول کے اعتبار سے ان اجزاء سے مقدم ہیں جو شروع میں ہیں۔ ایک ہی وقت میں متعدد سورتیں نازل ہو رہی ہیں۔ ابھی جو آیتیں اُتریں انہیں کسی سورہ میں رکھوایا جا رہا ہے اور کچھ دیر بعد کچھ دوسری آیتیں نازل ہوئیں اُنہیں کسی اور سورہ کا جُز بنوایا جا رہا ہے۔ اس طرح ایک ہی ساتھ بہت سی سورتیں اپنے تکمیلی مراحل سے گزر رہی ہیں۔ ایک سورۃ جس کا نزول بعد میں شروع ہوا وہ اپنے اختتام کو جا پہنچی، مگر ایک دوسری سورۃ جس کا نزول مہینوں پہلے شروع ہوا تھا، اسے اپنے درجۂ کمال تک پہنچنے کے لیے ابھی مہینوں اور برسوں کا انتظار کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:-

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بیک زمانہ

يُنْزَلُ عَلَيْهِ السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ فَكَانَ إِذَا تَنَزَّلَ عَلَيْهِ شَيْئٌ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَقَالَ ضَعُوا هٰؤُلَاءِ الْاٰيَاتِ فِي السُّوْرَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا،، (ترمذی)

متعدد سورتیں اُترا کرتی تھیں۔ جس وقت کوئی چیز نازل ہوتی، اسی وقت اپنے کسی کاتب کو بُلا کر آپ فرما دیتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورہ میں رکھو۔

ایک ایک سورۃ کی اندرونی ترتیب و تدوین ہی کی طرح ان سب کی باہمی ترتیب کا بھی یہی حال ہے۔ قرآن جب مدون فرمایا گیا تو ایسا نہیں ہوا کہ جو سورہ پہلے نازل ہوئی تھی اسے پہلے، اور جو بعد میں اُتری تھی اس کو اس کے بعد اور اس سے متصل ہی رکھ دیا گیا ہو، اور اس طرح پورے قرآن کی ساری سورتوں کو نزولی ترتیب کے مطابق مدون کر دیا گیا ہو۔ ایسا جس مصلحت اور حکمت کی بنا پر کیا گیا، اس کی وضاحت تو آگے آرہی ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ سورتوں کو ان کی نزولی ترتیب کے مطابق مدون کر دینے کی کوئی شکل پائی بھی نہیں جا سکتی، کیونکہ یہ جس طریقے سے نازل ہو رہی تھیں (جس کا تعارف ابھی آپ سے کرایا جا چکا ہے) اس کے پیش نظر تو بسا اوقات یہ فیصلہ کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کہ نزول کے اعتبار سے کون سی سورۃ مقدم ہے اور کون سی مؤخر۔ چنانچہ اپنے بعض اجزاء کے لحاظ سے ایک ہی سورت ایک دوسری سورت سے اگر مقدم ہے تو بعض دوسرے اجزاء کے لحاظ سے اس سے مؤخر بھی ہے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کیا گیا کہ مکّی سورتوں کو ایک ساتھ اور ایک سلسلے میں رکھ دیا گیا ہو، اور مدنی سورتوں کو ایک ساتھ مرتب کر دیا گیا ہو۔ یعنی سورتوں کی تدوینی ترتیب میں جس طرح نزولی ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے اسی طرح مکّیت اور مدنیّت کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اور ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے انہیں کسی اور ہی انداز پر مرتب و مدون فرمایا گیا ہے۔ نزولی ترتیب ہی کے مطابق قرآن کو مدون نہ کیے جانے کی مصلحت اور حکمت کیا تھی؟ یہ حقیقت بڑی آسانی سے کُھل جائے گی اگر آپ کیفیتِ نزول کی اس بحث کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیں جو ابھی اوپر گزر چکی ہے۔ جب یہ قرآن معروف معنوں کی کوئی کتاب نہیں ہے کہ اس میں ایک موضوع متعین کر کے اس کے تمام گوشوں پر خالص علمی، فنی اور

نظریاتی انداز میں ترتیب وار بحث کی گئی ہو، بلکہ اس کی حیثیت فی الواقع ایک رہنما کی بروقت عملی ہدایتوں اور ایک داعی کے خطبات کی سی ہے، (جیسا کہ آگے چل کر تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا) اور اس کا نزول اس ترتیب سے ہوا تھا جس ترتیب سے دعوت کا آغاز اور ارتقاء ہوا تھا تو ظاہر بات ہے کہ جب دعوت اپنے درجۂ کمال کو پہنچ گئی اور اسی کے ساتھ قرآن کا نزول بھی مکمل ہو گیا تو اب اس پورے سلسلۂ وحی کو مدون کرنے کے لیے وہ ترتیب کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتی تھی جو دعوت کی روزمرّہ کی ضرورتوں کے پیش نظر ہی اختیار کی گئی تھی یقیناً ان خدائی ہدایتوں اور پیغاموں کو اب ایک مستقل کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کے لیے ایک دوسری ہی ترتیب درکار تھی جس میں تکمیل دعوت کے حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہو۔ ایسا کرنا اُن لوگوں کے لحاظ سے بھی ضروری تھا جو اس دین پر ایمان لا چکے تھے، اور اُن لوگوں کے لحاظ سے بھی جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے یا جو آئندہ پیدا ہونے والے اور اس قرآن کے مخاطب ہونے والے تھے۔

اُن لوگوں کے لحاظ سے جو ایمان لا چکے تھے، اس لیے کہ پہلے ان کی حالت اسلام سے ناآشنائے محض کی تھی، اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر بالکل شروع سے کام کرنا تھا۔ اس لیے ان کے لیے ہدایت اور احکام کے سلسلے میں صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ ان کے اندرونی اور بیرونی حالات کیا ہیں؟ اور وہ کس وقت کس قسم کی ہدایت کے محتاج ہیں؟ لیکن تکمیل دعوت کے بعد ان کی حیثیت یکسر بدل چکی تھی۔ اب وہ قرآن پر دل اور دماغ کی ساری آمادگیوں کے ساتھ ایمان لا چکے تھے، اور ایمان لا کر "امت مسلمہ" بن چکے تھے وہ اُمّتِ مُسلمہ جو پیغمبر علیہ السلام کے بعد دعوتِ حق کی علم بَردار تھی، اور اس مشن کو جاری رکھنے کی ذمّہ دار قرار دی جا چکی تھی جسے پیغمبرؐ نے خطّہ عرب کی حدود میں تمام نظری اور عملی حیثیتوں سے مکمل کر کے اس کے سپرد کیا تھا۔ صورتِ حال کی اس بنیادی تبدیلی کا صریح تقاضا تھا کہ اب قرآن اُن کے لیے اپنی نزولی ترتیب کے بجائے ایک نئی ترتیب کے ساتھ مدوّن ہو۔ ایسی ترتیب کے ساتھ جس میں دینی حقائق کو سمجھانے، احکامِ شریعت کو بیان کرنے اور روحِ دین کو واضح کر دینے کے لیے بہترین اسلوبِ کلام اور غایت درجہ حکمتِ بیان ملحوظ رکھی گئی ہو۔ تاکہ وہ اللہ کے کلام کو مختلف بے جوڑ ٹکڑوں اور بے ربط

شذروں کی صورت میں دیکھنے اور اس کی تعلیمات کو منتشر ہدایتوں کا مجموعہ پانے کے بجائے مرتب و منظّم شکل میں دیکھ سکیں۔

رہے وہ لوگ جو ابھی تک کسی وجہ سے ایمان نہیں لائے تھے۔ یا جن تک یہ دعوت ابھی پہنچی ہی نہ تھی، یا انہوں نے ابھی عالم ہستی میں قدم ہی نہیں رکھا تھا اور بعد میں چل کر اس دعوت کے مخاطب و مکلّف بننے والے تھے۔ تو ان کے لحاظ سے بھی ترتیب نو کی اتنی ہی شدید ضرورت تھی جتنی کہ مقدم الذکر لوگوں کے لحاظ سے تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی کلام کا مدعا اس وقت تک پوری طرح نہیں کُھل سکتا جب تک کہ وہ حُسنِ تناسب کے زیوروں سے آراستہ نہ ہو، اور اس کے مختلف اجزاء کو موزوں ترتیب اور صحیح نظم کے ساتھ پیش نہ کیا گیا ہو۔ اور کوئی شک نہیں کہ جب تک کسی کلام کا مدّعا پورے طور پر واضح نہ ہو اسے پذیرائی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اب اگر قرآن قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا واحد منظور شدہ ہدایت نامہ تھا، اور ہر فرد اور ہر قوم کے لیے اسے کتابِ الٰہی تسلیم کرنا ضروری تھا (جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے) تو غور فرمائیے، آمادہ اور سنجیدہ ذہنوں کے لیے بھی اس قرآن کے حقیقی معانی اور محاسن کا پورے طور سے پا لینا کتنا دشوار ہوتا اگر اسے نزولی ترتیب کے مطابق ہی مدون کر دیا جاتا؟ اور لوگوں پر حق کی حجت کیسے قائم کی جا سکتی تھی اگر اللہ کی یہ کتاب اُن کے سامنے منطقی ترتیب اور حُسنِ بیان کی حکمتوں سے پُر ایک مربوط، متناسب، اور منظم کلام کی شکل میں نہ آتی۔؟

ان وجوہ کے پیش نظر حق یہ ہے کہ اگر قرآن کو نزولی ترتیب کے مطابق ہی مدوّن کر دیا جاتا تو وہ وحیِ محمدیؐ اور ہدایتِ الٰہی کا ایک "روزنامچہ"، تو ضرور بن جاتا، اور آج تاریخ نزول کے شائق کے لیے وہ بڑی دلچسپی کی چیز بھی ہوتا، مگر پھر ایسا بھی ضرور تھا کہ شائقینِ ہدایت کے لیے وہ سراپا ہدایت نہ ہوتا، اور اس کی کتنی ہی روح پرور حقیقتیں گم ہو کر رہ جاتیں۔

تاریخِ تدوین

اَب آئیے یہ معلوم کریں کہ قرآن کی تدوین کب ہوئی ؟ اور کن ہاتھوں انجام پائی ؟ اس غرض کے لیے ہمیں جن ذرائع کی طرف رجوع کرنا چاہیے، وہ دو ہیں :-

ایک ۱ تو خود قرآن کا اپنا بیان، دوسرے ۲ تاریخ کی شہادت :-

(۱) اس مسئلے کے بارے میں قرآن میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :-

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَءْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔

(سورۂ قیامۃ)

اے محمدؐ یقین رکھو، یہ بات ہمارے ذمہ ہے کہ اس قرآن کو جمع کریں اور اسے پڑھ کر سنا دیں تو اسی کے مطابق تم بھی پڑھو۔

" جب ہم پڑھ کر سُنا دیں" سے مراد یہ ہے کہ ہمارا فرشتۂ وحی (جبرئیل) پڑھ کر تمہیں سُنا دے۔ یہ الفاظ اپنے مدعا میں بالکل واضح ہیں اور ان سے تدوین قرآن کے مسئلہ کا ہر ایک پہلو پوری طرح روشن ہو جاتا ہے۔ مثلاً :-

قرآن ۱ کے " جمع " کر دینے میں خود نبیؐ کے اپنے ارادے، فعل، اختیار اور اجتہادِ رائے کا کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ کام بالکلیہ اللہ تعالیٰ کا انجام دیا ہوا ہے۔ نبیؐ کا کام اور فرض اس سلسلے میں صرف یہ تھا کہ وہ قرآن کو جبرئیل امین کی زبان سے سُنے، اور جس طرح سُنے اسی طرح خود بھی پڑھے :-

اس ۲ جمع قرآن کے مفہوم میں ترتیب و تدوین کی بات بھی لازماً شامل ہے۔ یعنی اس آیت سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ پورا قرآن اللہ کا جمع کردہ ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تدوین بھی آسمانی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے جبرئیلؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی آیتوں اور سورتوں کو کسی نہ کسی ترتیب ہی سے سنایا تھا، اس لیے فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ کا مطلب صرف یہی نہیں ہوا کہ جبرئیل جو کچھ تمہیں پڑھ کر سُنائیں اسی کو تم بھی پڑھو، بلکہ یہ بھی ہوا کہ آیتوں اور سورتوں میں وہ جو ترتیب رکھیں وہی

ترتیب تم بھی رکھنا۔ اس لیے اس آیت میں جس "جمعِ قرآن" کا ذکر ہے، اور جسے اللہ نے اپنی ذمہ داری فرمایا ہے، وہ قرآن کے لفظوں، آیتوں اور سورتوں کا مطلق "جمع" نہیں ہے بلکہ ایسا "جمع" ہے جس میں ترتیب وتدوین کا مفہوم بھی لازماً شامل ہے۔

یہ جمع وترتیب ربانی نبیؐ کی موجودگی ہی میں سرانجام پائی۔ ایسا نہیں ہوا کہ قرآن نبیؐ پر تو منتشر آیتوں اور غیر مرتب سورتوں کی شکل میں نازل کیا گیا ہو، اور پھر جب آپؐ دنیا سے تشریف لے جا چکے تو یہ وعدۂ خداوندی پورا ہوا ہو۔ کیونکہ ایسی حالت میں نبیؐ سے یہ کہنے کے کوئی معنیٰ نہ ہوتے کہ "جب ہم اُسے پڑھ کر سُنا دیں تو اُسی کے مطابق تم بھی پڑھنا۔"

ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی عقلاً اور نقلاً، دونوں حیثیتوں سے ایک مسلّم حقیقت کا مقام رکھتی ہے، اور وہ یہ کہ نبیؐ نے اپنی نبوت کے آخری لمحوں میں قرآن کو جس حیثیت، نوعیت اور ترتیب کے ساتھ اُمت کے حوالہ کیا وہ بعینہٖ وہی تھی جس کے ساتھ وہ اسے جناب باری تعالیٰ کی طرف سے مرحمت فرمایا گیا تھا۔ عقل عام کہتی ہے کہ جو کتاب قیامت تک کے لیے انسانی زندگی کا ہدایت نامہ بننے والی تھی وہ رسولؐ سے اصحاب رسول تک ٹھیک اسی شانِ کمال کے ساتھ پہنچی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کا نبیؐ کو یہ حکم دینا کہ:-

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (سورۂ مائدہ)	اے پیغمبر! تمہارے رب کی جانب سے جو کچھ تم پر نازل فرمایا گیا ہے اسے (جوں کا توں) لوگوں تک پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا حقِ پیغام رسانی ادا نہیں کیا۔

شہادت دیتا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ جب قرآن کے صرف الفاظ وآیات ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ اس کی ترتیب وتدوین بھی اسی کی طرف سے ہے، جیسا کہ پچھلی آیت سے معلوم ہو چکا، تو یہ ترتیب وتدوین بھی لازماً مَآ اُنزِلَ

اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ کے اندر شامل قرار پائی۔ جس کے بعد اس "حکم تبلیغ" کی پوری تعمیل صرف اتنی بات سے ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ نبیؐ قرآن کو انہی الفاظ کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دے جن کے ساتھ وہ اترا تھا۔ بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اسے اسی نظم و ترتیب کے ساتھ لوگوں کو پہنچائے جس نظم و ترتیب کے ساتھ اسے اپنے پروردگار کی طرف سے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

(۲)، تاریخی روایات سے اس امر کی جو وضاحت ملتی ہے اس سے صورتِ واقعہ روشن سے روشن تر ہو جاتی ہے۔ ترمذی شریف کی یہ روایت اور حضرت عثمانؓ کا یہ بیان ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ آپ پر جب کچھ نازل ہوتا، آپ اسی وقت اپنے کاتبینِ وحی کو بلاتے اور ارشاد فرماتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورہ میں اور فلاں مقام پر رکھو، اس کے بعد اس ضمن کی مزید تفصیل بھی سنیے:-

كَانَ جِبْرِيْلُ كَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ حَتّٰى يَنْسَلِخَ يَعْرِضُ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنَ

(بخاری فضائل القرآن)

کیونکہ حضرت جبرئیلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پورے رمضان ہر رات آکر ملا کرتے تھے۔ اس ملاقات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قرآن سنایا کرتے تھے۔

كَانَ يَعْرِضُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنَ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً فَعَرَضَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ فِي الْعَامِ الَّذِيْ قُبِضَ۔ (بخاری۔ کتاب فضائل القرآن)

حضرت جبرئیل، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر سال رمضان میں ایک بار قرآن پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اور جس سال آپ نے وفات پائی، اُس سال دو بار پڑھ کر سنایا تھا۔

ان روایتوں اور بیانوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے سلسلے میں حضرت جبرئیل کا کام قرآن کی وحی پہنچا دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا تھا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

اس بات پر بھی مامور تھے کہ ہر سال کے رمضان میں اب تک کا نازل شدہ کل قرآن آنحضرت کو پھر سے اکٹھا سنا دیا کریں، اور اسی طرح آپ سے سُن بھی لیا کریں، جب حیات نبویؐ کا آخری رمضان آئے تو اب پورے قرآن کو (کیونکہ وہ اس وقت قریب قریب مکمل ہی ہوچکا ہوگا) ایک بار کے بجائے دو بار پڑھ کر سنائیں اور آپ سے پڑھوا کر سُن لیں۔ چنانچہ حضرت جبرئیل نے ایسا ہی کیا۔ غور کیجیے کہ آخری رمضان میں اللہ کے فرشتے اور اس کے رسولؐ نے قرآن، کو جو دُو دُو بار ایک دوسرے کو پڑھ کر سنایا، اس میں کوئی ترتیب، آیتوں کی ترتیب ہو یا سورتوں کی ترتیب نہ رہی ہوگی؟ ظاہر ہے کہ ایسا خیال کرنا بالبداہت غلط ہوگا، اور اسے قطعی طور پر ایک متعینہ ترتیب ہی کے ساتھ پڑھا اور سُنا گیا تھا، اور کوئی شک نہیں کہ یہ وہی ترتیب تھی جو اللہ تعالیٰ کے یہاں پہلے سے مقرر اور اس کے ارشاد " هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ " کے مطابق لوحِ محفوظ میں موجود تھی۔ پھر بالکل فطری اور بدیہی بات ہے کہ یہی ترتیب آپ نے امت کو بھی ارشاد فرمائی، اور اسی ترتیب کے ساتھ اُمت اُسے آج تک مسلسل پڑھتی چلی آرہی ہے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آج اُمت قرآن کو جس ترتیب کے ساتھ پڑھ رہی ہے اس کی سند تواتر کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ آپؐ نے یہ ترتیب صحابہ کو سکھائی۔ انہوں نے تابعین تک پہنچائی۔ تابعین نے اپنے بعد کے لوگوں کو یہ امانت سپرد کی، اور اس طرح یہ سلسلہ برابر چلتا چلا آرہا ہے۔

غرض قرآن مجید کی تدوینی ترتیب خالص توقیفی ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا، حتیٰ کہ نبیؐ کا بھی اس میں مطلق کوئی دخل نہیں۔

البتہ اس جمع و ترتیب کے بعض ضمنی اہتمامات ایسے بھی ہیں جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد دورِ خلافت میں انجام پائے۔ جہاں تک، قرآن حکیم کی ترتیب و تدوین کا، اس کی تحریر و کتابت کا اور اس کے اسی ترتیب کے ساتھ لوگوں کو یاد کرا دینے کا سوال ہے وہ تو کسی معمولی شک کے بغیر عہد نبویؐ ہی میں مکمل ہو چکا تھا، اور حفاظ کے سینوں میں ٹھیک اسی طرح مرتب و مدون ہو چکا تھا۔ مگر وہ نوشتے اور صحیفے، جن میں یہ قرآن لکھوایا گیا تھا، وہ اپنی ظاہری حالت میں الگ الگ اجزاء کی شکل میں، اور متفرق تھے۔ جب وفات نبویؐ کے بعد پہلے ہی سال

بنو حنیفہ نامی قبیلے سے بمقام یمامہ مسلمانوں کی جنگ ہوئی اور اس میں بے شمار حفاظ قرآن شہید ہوگئے تو حضرت عمرؓ کو معًا یہ خیال آیا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرما رکھا ہے، لیکن ہماری ایمانی ذمہ داریوں کا تقاضا ہے کہ اس وعدۂ الٰہی کی تکمیل کا ہم بھی ذریعہ بنیں، اس لیے ہمیں قرآن کی کامل حفاظت کا ظاہری اہتمام پوری احتیاط سے کر لینا چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی آپ حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو خلیفۂ وقت اور جانشین رسولؐ تھے۔ ان کے سامنے پوری صورتِ حال پیش کرتے ہوئے حضرت عمر نے یہ تجویز رکھی کہ مختلف چیزوں پر لکھے ہوئے قرآن کو ایک شیرازہ میں جمع کرا دیجیے۔ پہلے تو انھوں نے یہ عذر کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ایک شیرازہ میں جمع نہیں کرایا، بلکہ اُمّت کو صرف یاد کرا دینے اور لکھا دینے ہی پر اکتفا فرمایا تو میں ایسا کیوں کروں؟ ظاہر ہے کہ یہ عشقِ رسولؐ کی حد تک بڑھی ہوئی پیروئ رسول کا مظاہرہ تھا۔ ورنہ اس تجویز میں منشائے الٰہی یا منشائے رسول سے کسی طرح کا بھی کوئی اختلاف یا تجاوز ہرگز نہ تھا چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصالح کی طرف توجہ پر توجہ دلائی تو جلد ہی وہ بھی اس ضرورت کو محسوس کر گئے، اور انہوں نے اس کے لیے عملی قدم اٹھا دیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو جو آنحضرت کی دائمی صحبت کے باعث کاتبینِ وحی کے سرخیل تھے، بلایا اور انہیں قرآن کی مسلسل کتابت اور اسے ایک جلد میں مرتب کر دینے کا حکم دیا۔ چند اور ممتاز ترین صحابہؓ کی معیّت میں حضرتِ زیدؓ نے یہ کام شروع کیا۔ حضرت عمرؓ نے مسجد نبویؐ کے سامنے کھڑے ہو کر اعلانِ عام فرمایا کہ جس شخص نے جس قدر سورتیں لکھ رکھی ہوں وہ ہمارے پاس لائے، چنانچہ ہر شخص اپنے نوشتے لے کر حاضر ہوا۔ حضرت زیدؓ اور اُن کے رفقائے کار گو خود سارے قرآن کے حافظ تھے، اور پھر آنحضرتؐ کے لکھائے ہوئے نوشتے ان کے پاس موجود تھے لیکن شدّتِ احتیاط کی انتہائی حدوں پر جا کر انہوں نے دوسری اور عام شہادتوں کی فراہمی بھی ضروری سمجھی، وہ جو کچھ لکھا ہوا پاتے اس پر کم از کم دو معتبر گواہ لیتے کہ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا ہے یا نہیں؟ اور فلاں نے جو کچھ سُنایا ہے اس نے آنحضرتؐ سے اسی طرح سُنا تھا یا نہیں؟ جب گواہ گزر جاتے تو اسے اپنے حافظے اور اپنے نوشتے سے ملا کر مقابلہ کرتے، تب کہیں جا کر اس کو قلم بند فرماتے۔

جب پورا قرآن لکھا جا چکا تو خلیفۂ رسولؐ اور امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کی حفاظت میں رکھ دیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ جب آپ بھی وفات پا گئے تو چونکہ آپؓ نے اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا، اس لیے آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے جو ام المومنین زوجۂ مطہرۂ رسول تھیں، اس نسخہ کو اپنی امانت میں رکھا۔ یہ گویا قرآن پاک کا "سرکاری نسخہ" تھا۔ اس لیے اس کی حیثیت ان دوسرے بے شمار نسخوں کے مقابلہ میں زیادہ مسلّم تھی جو عام افراد کے پاس تھے، اور جنہیں انہوں نے اپنے طور پر تیار کر رکھا تھا۔

اس طرح ایک عرصے تک قرآن پورے کا پورا ایک جلد کی سی حالت میں اکٹھا ہو کر مرکزِ خلافت میں موجود رہا، اور عام لوگوں کا اعتماد اپنے حافظہ پر، نیز اپنے نجی نوشتوں پر رہا یہاں تک کہ خلیفۂ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ (۲۳ھ) آیا، جب کہ اسلام حدودِ عرب سے نکل کر مشرق میں ایران اور مغرب میں مصر تک پھیل چکا تھا، اور کثیر تعداد میں جو لاکھوں سے آگے بڑھ کر کروڑوں تک پہنچتی جا رہی تھی۔ اہلِ عجم اس کے حلقہ بگوش ہو چکے اور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یہ لوگ عربی سے قطعی نابلد تھے، اس لیے قرأتِ قرآن میں غلطیاں کرنے لگے۔ حتیٰ کہ شام اور عراق کے لوگ بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ آرمینیہ اور آذربائیجان کی جنگ کے موقعہ پر ان دونوں مقامات کے لوگ اکٹھے ہوئے تو حضرت حذیفہؓ کو یہ دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی کہ قرآن پڑھنے کے طرز اور لب و لہجہ میں یہ لوگ بڑا اختلاف کر رہے ہیں۔ لڑائی سے واپس آ کر آپ نے حضرت عثمانؓ کو اس صورتِ حال سے باخبر کیا، اور انہیں اس امر پر توجہ دلائی کہ اُس خرابی اور فتنہ کا دروازہ بند کر دیجیے۔ جو مستقبل میں اس اختلاف سے پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح پہلے کے لوگوں نے آسمانی کتابوں کو مسخ کر کے رکھ دیا اہل اسلام بھی قرآن کے بارے میں اختلافات کا شکار ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے وقت کی اس اہم ترین دینی خدمت کا فوری احساس کیا اور یہ طے فرما لیا کہ اصل قرآن کی نقل صحیح قریشی قرأت کے مطابق لے کر تمام اسلامی صوبوں میں بھیج دی جائے، تاکہ لوگ اسی کے مطابق قرآن پڑھیں اور اختلافات میں مبتلا نہ ہوں۔

اس غرض سے آپ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے وہ صندوق طلب فرمایا جس میں حضرت ابو بکر کا لکھایا ہوا نسخہ رکھا ہوا تھا، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو تین اور جلیل القدر صحابہ، عبد اللہ بن زبیرؓ، سعیدؓ بن العاص اور عبد الرحمٰنؓ بن حارث کی معیت میں مناسب ہدایات کے ساتھ اس کارِ عظیم پر مقرر فرما دیا۔ جب متعدد نقلیں ہوگئیں تو آپ نے ایک ایک نقل مصر، کوفہ، بصرہ، مکّہ، شام، یمن اور بحرین کے گورنروں کے پاس بھجوا دی، اور تحریر فرما دیا کہ یہ نسخہ قرأت صحیحہ کے مطابق لکھ دیا گیا ہے، لوگوں کو ہدایت کی جائے کہ اسی نسخہ کے مطابق قرآن کی تلاوت کریں۔ ایک نقل مدینہ میں خود اپنے پاس رکھ لی تھی جس کا نام 'امام' تھا جس وقت آپ شہید کیے گئے تھے، اس وقت اسی نسخہ کی تلاوت فرما رہے تھے۔ حضرتِ عثمان کے نقل کرائے ہوئے نسخے مکہ، مدینہ، دمشق اور فارس (مراکش) میں اب تک موجود ہیں۔

جمع قرآن کے سلسلے میں یہ دو باتیں ہیں جو وفاتِ نبویؐ کے بعد انجام پائیں۔ مگر ظاہر ہے کہ جمع و تدوینِ قرآن کے توقیفی ہونے پر ان امور کا ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ فی الواقع ان باتوں کا تعلق جمع و تدوینِ قرآن کے مسئلے سے ہے ہی نہیں۔ ان کا تعلق اگر ہے تو حفاظتِ قرآن کے مسئلے سے ہے۔ اور حقیقت میں یہ امور بھی اُسی وعدۂ الٰہی کی تکمیل کا ایک حصّہ تھے جو حفاظتِ قرآن کے باب میں کیا گیا تھا، اور اسی غیبی اہتمام کی تکمیلی کڑیاں تھے جو قرآن کے تا قیامت محفوظ رکھنے کے بارے میں موعود اور مقدر تھا۔ ویسے یہ کارنامے بجائے خود حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے مبارک ترین کارنامے ہیں۔ اور ان خوش بخت انسانوں پر اُن کے رب کا یہ عظیم ترین احسان ہے کہ اُنھیں یہ سعادت ارزانی ہوئی۔

کتابِ محفوظ

قرآنِ مجید کا ایک مخصوص اور امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ جوں کا توں محفوظ ہے۔ اس امر کا سرسری تذکرہ پچھلے صفحات میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی اہمیت کی بات نہیں ہے، بلکہ بڑا ہی عظیم اور دوررس نتائج پیدا کرنے والا مسئلہ ہے۔ اور اس کی اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی جائے۔

"محفوظ" ہونے کا مفہوم

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابلِ توجہ بات تو یہ ہے کہ "محفوظ" ہونے کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ یعنی یہ معلوم کر لیا جائے کہ کسی کتابِ الٰہی کے محفوظ باقی رہنے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ لغت، عقلِ عام اور مقصدِ وحی، یہ ہیں وہ چیزیں جن سے اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہیے ان کی طرف سے اس سوال کا جو جواب ملتا ہے وہ یہ ہے:

کسی کتابِ الٰہی کے محفوظ باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ:

(ا) اس کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے نازل فرمائے گئے تھے۔

(ب) ان الفاظ میں باہمی ربط و ترتیب، نیز ان سے بنے ہوئے جملوں اور فقروں کا سلسلہ بھی ٹھیک وہی ہے جسے اس کتاب کے لانے والے پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا تھا۔

(ج) اس میں سے کوئی ایک کلمۂ خداوندی بھی ضائع نہیں ہوا ہے، نہ اس طرح کہ وہ بالکل غائب ہو گیا ہو، نہ اس طرح کہ اس کو ہٹا کر اس کی جگہ کوئی اور لفظ رکھ دیا گیا ہو یا اس کا

کسی اور زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہو۔

(د)، اس میں کوئی لفظ بڑھایا نہیں گیا ہے، حتیٰ کہ اس کے لانے والے پیغمبر کا اپنا بھی کوئی لفظ اس کے اندر آداخل نہیں ہوا ہے۔

ان باتوں میں سے اگر کوئی ایک بھی ناپید ہو جائے تو پھر کتاب کو صحیح معنوں میں محفوظ ہرگز نہ کہا جا سکے گا۔ کیونکہ ایسی حالت میں یہ یقین اور اطمینان لازمی طور پر رخصت ہو رہتا ہے کہ اس کتاب سے اس کے نازل کرنے والے کا منشا اب بھی پورے کا پورا سمجھا اور معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کسی عبارت میں الفاظ کی کمی بیشی تو درکنار، اگر ان کی ترتیب بھی بدل دی جائے تو، گو الفاظ سارے کے سارے وہی رہیں گے جو اصل میں تھے، مگر معانی کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے۔

محفوظیت قرآن کا ناگزیر سوال

جس طرح کسی مدّعی نبوّت کے بارے میں سب سے پہلا ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوائے نبوّت میں صادق ہے یا نہیں، اور یہ کہ اُس کی صداقت کے دلائل کیا ہیں؟ اسی طرح کسی نبئ برحق کے نام سے پیش کی جانے والی کتاب کے بارے میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ وہی کتاب ہے جو اس پر نازل ہوئی تھی؟ اور اگر وہی کتاب ہے تو وہ پوری طرح محفوظ بھی باقی رہ گئی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہو سکتا ہے ایک شخص واقعی معنوں میں اللہ کا رسول تو ہو، لیکن جو کتاب اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کی تھی وہ گم ہو چکی ہو، اور آج اس کے نام سے کوئی اور ہی نوشتہ پیش کیا جا رہا ہو، یا نام کی حد تک تو وہ وہی کتاب ہو جو اس رسولؐ نے اپنے پیروؤں کو دی تھی، لیکن بعد میں اس کے اندر کمی بیشی ہو چکی ہو، یا اس کے الفاظ اور مضامین کی ترتیب میں اُلٹ پلٹ ہو گئی ہو، یا اصل کتاب تو کسی اور ہی زبان میں نازل ہوئی تھی اور اب کسی اور زبان میں اس کا صرف ترجمہ موجود رہ گیا ہو۔ ظاہر ہے، اس طرح کی کوئی بات بھی اگر پیش آ چکی ہو تو ایسی حالت میں اس کتاب کو محفوظ نہ کہا جا سکے گا۔ اور جو کتاب "محفوظ" نہ رہ گئی ہو اس سے وہ غرض پوری طرح ہرگز

حاصل نہ ہوسکے گی جس کے لیے کوئی آسمانی کتاب نازل ہوتی ہے۔اس کے بعد اس کی حیثیت بھی وہ باقی نہیں رہ سکتی جس کی کہ اس تحریف یا تغیر سے پہلے وہ مالک تھی، اور اب اس کے واجب الاتباع ہونے کا حق بھی اس حد تک لازمًا کمزور رہے گا۔جس حد تک کہ اس میں تحریف یا تغیر راہ پا چکا ہے۔

اس لیے کسی بھی کتابِ الٰہی کے بارے میں انسانی ذہن کو یہ سوال، اور پھر یہ تحقیق کرنا ہی چاہیے کہ وہ اپنی اصل حالت میں باقی رہ گئی ہے یا نہیں؟ خصوصًا قرآن مجید کے بارے میں تو اس سوال کا اٹھنا اور اس امر کی تحقیق کرنا قطعی ناگزیر ہے۔کیونکہ دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلے میں وہ ایک مختلف اور ممتاز حیثیت کی بھی دعوے دار ہے، یعنی وہ عام کتابوں ہی جیسی ایک کتاب نہیں ہے، بلکہ ایسی کتاب ہے جس نے ساری پُرانی کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے، جس کے بعد اب اور کوئی کتاب نازل نہ ہوگی۔جو ساری دنیا کے لیے واجب الاتباع ہے اور جو اب قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا واحد منظور و مقبول ہدایت نامہ ہے ___ اس کے ان دعووں کے پیش نظر اس کی محفوظیت کا مسئلہ صرف ایک نظری اور علمی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ انسانی زندگی کا اہم ترین عملی مسئلہ بن جاتا ہے، اس کی دنیوی فلاح اور اس کی اُخروی نجات دونوں اس سے متعلق ہو جاتی ہیں اور اس کی یہ ممتاز حیثیت تقاضا کرتی ہے کہ جب تک اس زمین پر انسان موجود ہے، وہ بھی مکمل طور پر محفوظ باقی رہے۔ورنہ انسان۔۔۔ہدایت، کہاں سے حاصل کر سکے گا؟ اس لیے قرآن اگر اپنے دعووں میں سچّا ہے تو ضروری ہے کہ اس کا حال وہ ہرگز نہ ہو جو پچھلی کتابوں کا ہو چکا ہے، بلکہ وہ لازمًا جوں کا توں محفوظ باقی رہے۔اس طرح کہنا چاہیے کہ اس کی محفوظیت اس کی صداقت کا ایک ضروری ثبوت بھی ہے۔ان ساری باتوں کی موجودگی میں اس سوال کے نہ اُٹھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آیا قرآن پوری طرح محفوظ ہے؟ اور کیا اس وقت جو کتاب قرآن کے نام سے دنیا کے سامنے موجود ہے، وہ اپنی زبان، اپنے الفاظ، اپنی عبارات، اپنی ترتیب اور اپنی قرأت، غرض ہر اعتبار سے بعینہٖ وہی کتابِ الٰہی ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔؟

حفاظتِ قرآن کا عملی اہتمام

اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا مناسب اور ضروری ہوگا کہ صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے محفوظ کرنے اور رکھنے کا کیا اہتمام فرمایا تھا؟ تاریخ اور احادیث سے اس اہتمام کی جو تفصیل ملتی ہے وہ مختصراً یہ ہے:۔

(۱) دربارِ رسالت میں باقاعدہ کاتبینِ وحی متعین تھے، جو سب سے زیادہ اہل اور نمایاں صحابہ میں سے چھانٹے گئے تھے۔ چنانچہ مکّی دور میں حضرت ابو بکر صدّیق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم، اور مدینہ آنے کے بعد ان حضرات کے علاوہ حضرت زبیر بن العوامؓ، ابی بن کعبؓ، حنظلہ بن الربیعؓ، زید بن ثابتؓ، اُبی بن فاطمہ، عبد اللہ بن ارقم شرجیل بن حسنہؓ، عبد اللہؓ بن رواحہ، امیر معاویہؓ، خالدؓ بن سعید اور آبان بن سعید وغیرہ چوبیس[۲۴]، اور بعض روایات کی رو سے بیالیس[۴۲] صحابہؓ اس خدمت پر مامور تھے، جن کو قرآن نے سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ط (باعزت اور نیکوکار لکھنے والے) فرمایا ہے جب کوئی وحی آتی، آپ فوراً کسی کاتبؓ سے ارشاد فرماتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد لکھ لو۔ جیسا کہ ترمذی کی یہ روایت اوپر درج کی جاچکی ہے کہ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی چیز نازل ہوتی تو آپؐ اپنے کسی کاتبِ وحی کو بلا کر فرماتے کہ اسے فلاں سورہ میں درج کرلو۔") کاتب جب نازل شدہ وحی کو لکھ لیتا تو آپ اس سے یہ لکھا ہوا پڑھوا کر سُنتے، اور اگر اس میں کتابت کی کوئی غلطی پاتے تو درست کرادیتے جیسا کہ کاتبینِ وحی کے سرخیل حضرت زیدؓ بن ثابت کا بیان ہے کہ " فَإِذَا فَرَغْتُ قَالَ اِقْرَأْهُ فَاقْرَأُهُ فَإِنْ كَانَ فِيهِ سَقْطٌ أَقَامَهُ "۔ (مجمع الزوائد جلد اول صفحہ ۶۰) اس کے بعد اس کی عام اشاعت کا حکم دے دیا جاتا۔ کاتبِ وحی اپنے فریضۂ کتابت سے فارغ ہو کر باہر آتا اور عام مسلمانوں کو یہ نیا نازل شدہ حصّہ پڑھ کر سُنا دیتا۔ اور لکھنا جاننے والے اسے خود بھی لکھ لیتے، باقی لوگ صرف زبانی یاد کر لینے پر اکتفا کرتے۔ اس طرح ایک طرف تو قرآن کی کتابت دسرکاری، اہتمام میں ہوتی رہتی تھی، دوسری طرف بہت سے صحابہؓ

اسے نجی طور پر بھی ضبطِ تحریر میں لاتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت اُبیؓ بن کعب، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت ابوزید وغیرہ نے تو پورا قرآن مرتب و مدون شکل میں لکھ لیا تھا۔ (بخاری، کتاب فضائل القرآن)

کتابت کے لیے باریک جھلی (رق)، دباغت شدہ پتلا چمڑا (ادیم) کھجور کی شاخوں کا نچلا حصّہ (عسیب)، سفید پتھر کی پتلی پتلی سلیٹیں (لخاف) اور اونٹ کے شانے کی چوڑی ہڈیاں (کتف) وغیرہ چیزیں استعمال کی جاتیں۔

(۲)، اس اندیشے سے کہ مبادا رسولؐ خدا کے اپنے ارشادات، جو بہرحال دین ہی سے متعلق ہوتے تھے، کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط ہو جائیں، آپ نے اپنے صحابہؓ کو حکم دے دیا تھا کہ "لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ شَيْئًا اِلَّا الْقُرْاٰنَ "سنن دارمی ص۲۶ (قرآن کے علاوہ اور جو کچھ تم میرے منہ سے سُنتے رہتے ہو اسے نہ لکھا کرو)

(۳)، ایک طرف تو ہر وہ لفظ جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے اترتا، اس اہتمام کے ساتھ جلد از جلد لکھ لیا جاتا تھا۔ دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُسے خود تو یاد کر ہی لیتے تھے ساتھ ہی اپنے ساتھیوں (یعنی صحابۂ کرامؓ) کو بھی یاد کرا دیا کرتے تھے۔ اور پھر اُن سے بار بار پڑھوا کر سنتے بھی رہتے تھے، اور خود بھی پڑھ کر انہیں سنایا کرتے تھے۔ تاکہ کوئی لفظ غلط نہ یاد ہو جائے۔ جو صحابہؓ بر وقت موجود نہ ہوتے اُنہیں بعد میں سکھا اور یاد کرا دیا جاتا۔ پھر اجتماعی طور پر بھی قرآن کے پڑھنے اور سننے کا خاص اہتمام تھا۔ مکہ میں حضرتِ ارقم مخزومیؓ کے گھر کو آپؐ نے تلاوت خانہ مقرر فرمایا تھا۔ وہیں مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے جایا کرتے اور قرآن خوانی کیا کرتے تھے۔ (یہ تاریخی اور مبارک مکان مکّہ میں اب تک موجود ہے) جب مدینہ تشریف آوری ہوئی تو یہاں قرآن کے پڑھنے پڑھانے والوں کی ایک مخصوص جماعت قائم ہو گئی، جو تاریخ اسلامی میں "اصحابِ صفّہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہ غربا تھے جو مکّے میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر آئے تھے، اور یہاں اُن کا اپنا کوئی ذاتی ٹھکانا نہ تھا، مسجد نبویؐ کے صفّے (چبوترے)، پر گزر کیا کرتے تھے۔ ان کی تعداد اچھی خاصی تھی، عام طور سے اسّی کے لگ بھگ۔ یہ لوگ عملاً اپنی پوری زندگی خدمتِ دین ہی کے لیے وقف

کیے ہوئے تھے۔ ایک طرف تو اُن کا کام یہ تھا کہ جب بیرونِ مدینہ کا کوئی قبیلہ اسلام لاتا تو اسے دین اور قرآن سکھانے جایا کرتے، دوسری طرف اس خدمت پر مامور تھے کہ جس وقت کوئی وحی آتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یاد کرا دیتے۔ اور وہ اچھی طرح یاد کر لینے کے بعد مدینے کی گلیوں میں پھیل جاتے، اور دوسروں کو سُنا کر یاد کرا دیتے۔ اس سارے اہتمام کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ ہوا کہ صاحبِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود پورے قرآن کے حافظ تو تھے ہی، بہت سے صحابہ بھی آپؐ کے ساتھ ساتھ پورے کا پورا قرآن اپنے سینوں میں محفوظ کرتے جاتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو دوسرے اصحاب رسول کے مقابلہ میں آنحضرتؐ کا فیض صحبت زیادہ حاصل تھا۔ جہاں تک باقی صحابہ کا تعلق ہے، ان میں کا بھی ہر شخص قرآن کا تھوڑا بہت حصہ ضرور ہی یاد کر لیتا اور یاد رکھتا تھا، اور کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس نے کچھ بھی یاد نہ کیا ہو۔ کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ اسلام اور ایمان کے ساتھ یہ بات کسی طرح جُڑ ہی نہیں سکتی کہ آدمی کو قرآن سرے سے یاد ہی نہ ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات خاص طور سے ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ اہلِ عرب قوتِ حافظہ میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتے تھے، ان کی زبردست قوتِ حافظہ کے واقعات اتنے عجیب و غریب ہیں کہ آج جب ہم انہیں کتابوں میں پڑھتے ہیں تو اُن پر افسانوں کا دھوکہ ہوتا ہے، وہ لمبے لمبے قصیدے چند بار سُن کر زبانی یاد کر لیتے، اُن کے لیے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں تک کے نسب نامے یاد رکھنا معمولی بات تھی۔ دراصل یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کے غیبی اہتمامات کی ایک کڑی تھی کہ اس نے قرآن کی اولین حفاظت کے لیے ایسی بے نظیر قوتِ حافظہ رکھنے والی قوم کا انتخاب کیا۔

قرآن کے محفوظ ہونے کے دلائل

ان ابتدائی معلومات کے حاصل کر لینے کے بعد آئیے اب اس مسئلہ کا جائزہ لیں کہ آیا موجودہ قرآن بعینہٖ وہی قرآن ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور جسے آپؐ نے اُمّت کے حوالہ کیا تھا۔

اس غرض کے لیے اگر آپ اس مسئلے سے تعلق رکھنے والے امور و حقائق پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ وہ دو قسم کے ہیں :۔ ایکؔ تو وہ جو عقلی دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے وہ قرآن مجید کی محفوظیت کا ثبوت مسلم اور غیر مسلم سبھی کے لیے بن سکتے ہیں، دوسؔرے وہ جو خود قرآنی بیانات سے ماخوذ ہیں، اس لیے صرف اہل اسلام ہی کے لیے حُجّت قرار پا سکتے ہیں۔

(۱) عقلی دلائل

پہلے عقلی دلائل کو لیجیے، اور یہ دیکھیے کہ خالص علمی، تاریخی اور عقلی تحقیق کی روشنی میں قرآن محفوظ ثابت ہوتا ہے یا نہیں ؟

ظاہر ہے کہ کسی ہدایت، کسی قانون یا کسی کتاب کو محفوظ رکھنے کی دو ہی شکلیں ہوا کرتی ہیں :۔ حفظؔ (زبانی یاد کر رکھنا) اور کتابتؔ (لکھ لینا) اس لیے، قرآن مجید کی محفوظیت کا حال معلوم کرنے کے معنی دراصل یہ دیکھنے کے ہیں کہ کیا اسے قابلِ اطمینان حد تک زبانی یاد رکھا گیا ؟ اور اگر یہ نہیں۔ تو کیا اُسے پوری احتیاط کے ساتھ قلم بند کر لیا گیا۔؟ اور پھر یہ زبانی یاد رکھنے یا قلم بند کرتے رہنے کا سلسلہ اب تک پورے اہتمام سے جاری چلا آ رہا ہے ؟

(۱)، قرآن مجید کے سلسلے میں جہاں تک حفاظت کی پہلی شکل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں واقعی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے تاریخ کے ان حقائق پر نظر ڈالیے:۔

(ا)، جس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے ہیں، آپؐ کے پیرووں اور قرآن پر ایمان لانے والوں کی ایک بھاری تعداد موجود تھی جو ہزاروں سے آگے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچی ہوئی تھی۔

(ب)، قرآن مجید کے پڑھنے، پڑھانے اور یاد رکھنے کے بارے میں آپؐ نے اپنے اِن پیرووں کو مسلسل ترغیبیں اور ہدایتیں دی تھیں، جن کے تذکروں سے حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، مثلاً "قرآن پڑھا کرو، کیونکہ قیامت کے دن وہ اپنے پڑھنے

والوں کے لیے شفیع بن کر آئے گا۔" (مسلم، کتاب فضائل القرآن) "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے۔" (بخاری، کتاب فضائل القرآن)، "قرآن کی یاد کو تازہ کرتے رہو" (ایضاً)، اسی طرح خود قرآن مجید کے اندر بھی اس طرح کی ترغیبیں اور ہدایتیں بکثرت موجود ہیں۔

دوسری طرف ان لوگوں کے سامنے قرآن کی بیان فرمودہ وہ وعیدیں اور ہلاکتیں بھی تھیں جن کے یہود اور نصاریٰ، اپنی کتابوں میں ردّ و بدل کر ڈالنے اور ان کے کچھ اجزاء کو بھلا بیٹھنے کے نتیجہ میں سزا وار قرار پا چکے تھے۔ گویا ان قوموں کی غفلت شعاریوں کا حال اور انجام بیان کر کے خود انہیں بھی متنبہ کیا جا چکا تھا کہ اگر تم نے قرآن کریم کا کوئی حصہ بھلا دیا، یا اس کے الفاظ و عبارات میں کسی قسم کا تغیر آ جانے دیا تو اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا۔ جو ان یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ کچھ تو کر چکا ہے اور ابھی بہت کچھ قیامت کے دن کرنے والا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں اس طرح کی چونکا دینے والی تنبیہیں کر رکھی تھیں کہ "جو کوئی قرآن پڑھتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہے وہ قیامت کے دن کوڑھی اٹھے گا۔" (ابوداؤد)

درج، زمانۂ نبوت میں دنیوی اور دینی دونوں ہی قسم کی عزتوں، عظمتوں، اور کامرانیوں کا اصل معیار علم قرآن تھا، جسے قرآن مجید کا جتنا ہی زیادہ علم ہوتا اس کا مرتبہ اتنا ہی بلند قرار پاتا۔ انتظامی ضرورتوں کے مواقع پر چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے امور تک میں سربراہ کاری کے لیے سب سے پہلے یہی دیکھا جاتا تھا کہ کون قرآن زیادہ جانتا ہے؟ کیونکہ قرآن ہی مملکت اور معاشرے کا بنیادی قانون تھا۔ اسلیے قدرتی طور پر کسی بھی منصب کے لیے انتخاب کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری تھا کہ اس "قانون" سے کون زیادہ واقف ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم کے لیے ایک بڑا دستہ مرتب فرمایا اور اس کا کمانڈر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جو سب سے کم عمر تھا، اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ تحقیق کے نتیجہ میں وہ سب سے زیادہ قرآن یاد کر لینے والا ثابت ہوا تھا۔ (ترمذی)

جہاں تک خالص دینی فضیلت کا تعلق ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی ہوگا۔ اُحد کے شہیدوں کو جب اُن کی کثرت کی وجہ سے، ایک ایک قبر کے اندر دو دو کی تعداد میں دفن کیا جانے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمانا شروع کیا۔ " اَیُّھُمْ اَکْثَرُ اَخْذً الِّلْقُرْاٰنِ " (ان میں سے کوئی قرآن زیادہ جانتا تھا؟) اور جب بتا دیا جاتا تو ایسے شخص کو قبر میں قبلہ کی طرف آگے رکھتے۔

(بخاری۔ کتاب الجنائز)

(د) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا دینی ذوق و شوق، عشق اور جنون کی حد کو پہنچا ہوا تھا، انہیں اپنے رسولؐ سے انتہائی شیفتگی اور اپنی کتاب سے غیر معمولی شغف تھا۔ قرآن کریم کی تلاوت اُن کا محبوب ترین مشغلہ، اور اُن کی روح کی مرغوب ترین غذا تھی۔ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو کسی دن بھی اس تلاوت سے یکسر بے بہرہ رہ گیا ہو۔ حتیٰ کہ کتنے ہی تو ایسے تھے جو ہر روز پورا قرآن پڑھ کر چین پاتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت تمیم داریؓ وغیرہ کے حالات پڑھیے۔ زمانۂ نبوت کی تاریخ میں ہم کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پاتے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ کسی صحابی کو آپ نے قرآن کم پڑھنے پر تنبیہ فرمائی ہو، جب کہ ایسے واقعات کثرت سے ملتے ہیں جن میں آپ لوگوں کو قرآن خوانی میں اعتدال سے کام لینے کی ہدایت دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے بارے میں جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ وہ ہر شب پورا پورا قرآن پڑھا کرتے ہیں تو اُنہیں اس سے روک دیا، اور فرمایا کہ "قرآن پورے ایک مہینے میں ختم کیا کرو"، انہوں نے کہا "میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں"، تو ارشاد ہوا " اچھا تو پھر سات راتوں میں ختم کیا کرو، اس سے زیادہ نہ پڑھو"۔ (بخاری۔ کتاب فضائل القرآن) اسی طرح حضرت قیسؓ بن صعصعہ نے آپؐ سے پوچھا کہ "قرآن کتنے دنوں میں ختم کیا کروں"، تو فرمایا "پندرہ دنوں میں"، گزارش کی کہ حضور! میں اس سے کم مدت میں بآسانی پڑھ لے سکتا ہوں، فرمایا "اچھا تو ہفتہ بھر میں ختم کیا کرو"، پھر عرض کی کہ "اس سے بھی کم وقت میں پڑھ سکتا ہوں، تو ارشاد ہوا کہ "بس اس سے کم وقت میں نہیں"۔ (کنز العمال)

(ه) پورا قرآن تیئیس سال کی لمبی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب رسولؐ کو قرآن یاد کر لینے کے لیے کئی کئی برس ملے تھے، جب کہ پورا قرآن حفظ کر لینے کے لیے دو ڈھائی برس بالکل کافی ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ہزاروں لاکھوں تجربات اور واقعات گواہی دے سکتے ہیں۔

(و) صحابہ کرام کی قوتِ حافظہ "لائف آف محمد" کے مصنّف سر ولیم میور جیسے مستشرق کے لفظوں میں بھی "حد درجہ بلند" تھی۔ کیونکہ یہ حضرات اس قوم عرب سے تعلق رکھتے تھے جو اس وصف میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتی تھی۔

ان ساری باتوں کو، جو تاریخ کی نہایت واضح اور ناقابل انکار حقیقتیں ہیں نظر میں رکھیے، پھر غور کیجیے کہ ان کا نتیجہ تجرباتی اور عقلی طور پر کیا ہو سکتا تھا؟ کیا اس کے سوا کچھ اور کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لاکھوں صحابہؓ میں ایسا تو کوئی بھی نہ رہا ہو جسے قرآن تھوڑا بہت بھی یاد نہ ہو اور ایسے بے شمار ہوں جنہیں قرآنِ کریم لفظ بہ لفظ پورا کا پورا حفظ ہو؟ نہیں، اور یقیناً نہیں۔ کیونکہ ایسے زبردست نفسیاتی محرکات اور فطری اسباب کی موجودگی میں یہ بات عملاً ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس پوری صورتِ حال کو دیکھ کر عقل کسی تامّل کے بغیر ہی فیصلہ دے سکتی ہے کہ حضرات صحابہؓ کرام میں پورے قرآن کے حافظوں کی ایک بھاری تعداد لازماً موجود رہی ہوگی، اور تاریخ کا بیان یہ ہے کہ بلاشبہ موجود تھی۔ چنانچہ وہ بتاتی ہے کہ جب مدینہ سے باہر کا کوئی قبیلہ اسلام لاتا تھا تو اسے قرآن کی تعلیم دینے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حافظِ قرآن صحابہؓ کو بھیجا کرتے تھے اور بسا اوقات ان کی تعداد کافی بڑی ہوا کرتی تھی۔ مثلاً ابو البراء نامی شخص نجد سے مدینہ آیا اور اپنے علاقہ کے لوگوں کو قرآن سکھانے کے لیے آپ سے معلمین بھیجنے کی درخواست کی، تو آپؐ نے اس کام کے لیے جن حفاظ کا تقرر فرمایا ان کی تعداد ستّر تھی۔ (زاد المعاد) غور کیجیے، جب ایک ایک علاقے کو بھیجے جانے والے حافظوں کی تعداد ستّر ستّر ہوا کرتی تھی تو کل حافظ قرآن کتنی بڑی تعداد میں رہے ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال بعد ہی یمامہ کی جو خون ریز جنگ ہوئی تھی اس میں بارہ یا چودہ سو مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ ان شہداء میں

سات سو حافظِ قرآن تھے۔ (مجمع الزوائد۔ بحوالہ حاشیہ بخاری جلد دوم)

دورِ صحابہؓ میں قرآن کے حافظوں کی یہ کثرت بعد کے مسلمانوں میں نہ صرف برابر قائم رہی، بلکہ ان کی تعداد کے بڑھتے رہنے کے ساتھ ساتھ یہ کثرت بھی بڑھتی چلی گئی، اور پھر کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جب اُمت کے اندر لاتعداد حفاظِ قرآن موجود نہ پائے گئے ہوں۔ تاریخ اسلام کی یہ ایک ایسی مسلمہ اور بدیہی حقیقت ہے جس کے بارے میں کسی شک اور تردد کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ چنانچہ آج بھی، جب کہ عام مسلمانوں کا دینی ذوق زوال کی انتہاؤں پر پہنچا ہوا ہے اور وہ گذشتہ زمانوں کے مقابلے میں دسواں بیسواں بھی نہیں رہ گیا ہے، آپ کوئی قابل لحاظ مسلم بستی ایسی نہ پائیں گے جس میں ایک دو حافظ قرآن موجود نہ ہوں۔

(۲) اب حفاظت کی دوسری شکل، حفاظت بذریعہ کتابت، کو لیجیے، اور اس سلسلے میں پہلے ذیل کے حقائق پر نظر ڈالیے:۔

(۱) جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے، اس وقت ایسا تو ضرور تھا کہ عرب میں کتابت کا رواج محدود اور اس کی سہولتیں کمیاب تھیں۔ مگر ایسا ہرگز نہ تھا کہ لکھنے پڑھنے کا وہاں کوئی وجود ہی نہ رہا ہو، چنانچہ تاریخ عرب کا مطالعہ کیجیے تو اس امر کی ناقابل تردید شہادتیں ملیں گی، اور کثرت سے ملیں گی کہ عرب میں، خصوصاً مکہ کے اندر لکھنے پڑھنے کا رواج قابلِ لحاظ حد تک موجود تھا، وہاں لوگ معاہدوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر دستاویزوں کی شکل میں رکھا کرتے تھے، اور نظموں اور قصیدوں کو قلم بند کر لیا کرتے تھے مثلاً:- مکے میں قریش کی پوری برادری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے، آپ کے خاندان بنی ہاشم کے، اور مسلمانوں کے خلاف مکمل بائیکاٹ کا جو معاہدہ کیا تھا اسے تحریری شکل دے کر کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا تھا۔ (ابن ہشام جلد اول) اسی طرح عربی کے مشہور قصائد "المعلقات السبع"، جن سے ہر عربی داں واقف ہے، انہیں معلقات، کہے جانے کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ لکھ کر درِ کعبہ پر لٹکا دیے گئے تھے (تاریخ الادب العربی ص۳۱)۔ بدر کی لڑائی میں قریش کے جو ستر افراد قید کیے گئے تھے، ان میں سے کئی آدمیوں کی رہائی کے لیے فدیہ اس امر کو قرار دیا گیا تھا کہ ایک ایک

شخص دس دس بچوں کو خوب اچھی طرح لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ (طبقات ابن سعد)
یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں کہ مکّے میں لکھنے پڑھنے کا خاصا رواج تھا، چنانچہ اس زمانے کے عربی کلام کا جائزہ لیجیے تو اس میں کتابت، اور اس سے تعلق رکھنے والے امور کا کثرت سے ذکر ملے گا۔ خود قرآن مجید میں قلم، مِداد (روشنائی) کتاب، کتابت، کاتب، املا (بول کر لکھانا) اکتتاب (لکھ لینا) سطور (لکھا ہوا) سفرۃ (لکھنے والے) صحیفہ (لکھے ہوئے ورق) لوح (تختی) رَق (جھلی سے بنائے ہوئے کاغذ) اور قرطاس وغیرہ الفاظ کا وجود اس بات کی ناطق دلیل ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب لکھنے پڑھنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔

(ب) قرآن مجید نے علمِ کتابت کو اللہ تعالیٰ کی ایک ممتاز نعمت اور غیر معمولی عطیہ قرار دیا ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نے اپنی سب سے پہلی وحی میں، جو صرف پانچ چھوٹی چھوٹی آیتوں تک محدود تھی، اللہ تعالیٰ کی جن نمایاں اور بڑی نعمتوں کا نام لیا ہے اُن میں سے ایک "قلم کے ذریعہ سکھانے" کی بات بھی ہے۔ (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ)

(ج) جہاں تک کاروباری زندگی کے اہم معاملات کا تعلق ہے، قرآن حکیم نے ان میں سے بعض کے سلسلے میں اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ انہیں لکھ لیا جایا کرے مثلاً:

اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ"
(بقرہ، ۲۸۲)

جب تم کسی متعینہ مدت کے لیے آپس میں قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ (متعلقہ دستاویز کو) لکھ دے۔ لکھنے والے کو لکھ دینے سے، جیسا کہ اللہ نے اُسے علم عطا کیا ہو، انکار نہ کرنا چاہیے پس اُسے چاہیے کہ لکھ دے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا، مدت کی وضاحت کے ساتھ اُسے لکھ لینے کو بوجھ نہ محسوس کرو)

ان تینوں حقیقتوں کی موجودگی قرآن مجید کی مسلسل اور مکمل کتابت کو از روئے قیاس جس طرح لازمی قرار دیتی ہے، اس کی وضاحت بالکل بے ضرورت ہوگی۔ جب تمام صحابہ لکھنے پڑھنے کے فن سے بے بہرہ نہ تھے، جب اول روز ہی سے قرآنِ حکیم نے اس فن کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور حصولِ علم کا ذریعہ فرمار کھا تھا، جب کاروباری معاملات کو بھی ضبطِ تحریر میں لانے کی ہدایتیں دی گئی تھیں تو! انسانی عقل کیسے باور کرسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے فدائے دین وایمان ساتھیوں نے قرآن مجید کو قلم بند کرنے کی طرف توجہ نہ دی ہوگی! حالانکہ ان کے نزدیک یہ قرآن سب سے اہم اور قیمتی شے تھا اور نوعِ انسانی کی دنیوی اور اُخروی فلاح ساری کی ساری اسی پر موقوف تھی، اور اس مسلّمہ حقیقت سے بھی وہ بے خبر نہ تھے کہ تحریر و کتابت ہی کسی کلام کو محفوظ رکھنے کا حقیقی اور سب سے زیادہ قابلِ اطمینان ذریعہ ہے۔

قیاس اور عقل کا یہ تقاضا سامنے آجانے کے بعد اب تاریخ کی زبان سے واقعات کی یہ شہادتیں سُنیے:۔

(ا)، جتنا قرآن نازل ہوتا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے قلم بند کراتے جاتے تھے، اس غرض کے لیے کاتبینِ وحی مقرر تھے۔ جب کوئی وحی نازل ہوتی تو آپ کسی کاتب کو بلاتے اور فرماتے کہ اسے لکھ لو (ترمذی، کتاب التفسیر) کاتبِ خاص حضرت زید بن ثابتؓ مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میں آپؐ کے حسب ارشاد لکھ چکتا تو آپ پڑھوا کر سُنتے، اور اگر تحریر میں کوئی غلطی پاتے تو اُسے درست کرادیتے۔

(مجمع الزوائد جلد اول ص۶۰)

(ب)، قرآن مجید میں خود کفار قریش کا یہ بیان موجود ہے کہ وہ مسلسل لکھا جاتا رہا ہے (وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ط) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو پچھلی کتابوں کی نقلیں ہیں۔ جنہیں اس شخص نے لکھ لیا ہے اور صبح و شام (کچھ لوگوں کی طرف سے) بول کر اُسے لکھایا جاتا رہتا ہے۔ الفرقان

(ج)، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کرام کو یہ ہدایت فرمارکھی تھی کہ "میری زبان سے

(سنکر) قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھا کرو۔" (دارمی باب من لم یر کتابتہ الحدیث)

(د)، ہجرت سے کافی دنوں پہلے کا واقعہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، اپنی بہن کے گھر پہنچے تو حضرتِ خبابؓ انہیں اور ان کے شوہر حضرت سعیدؓ بن زید کو سورہ طٰہٰ پڑھا رہے تھے، ان کے آنے کی آہٹ پاکر حضرت خبابؓ ایک طرف کو ہٹ گئے، اور وہ صحیفہ، جس سے حضرتِ خبابؓ ان دونوں کو سورہ طٰہٰ پڑھا رہے تھے، حضرت عمرؓ کی بہن نے اپنی ران کے نیچے چھپا لیا، جب انہوں نے ان سے کہا کہ مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے میں نے ابھی تمہیں پڑھتے سنا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اسے حالتِ پاکی ہی میں چھوا جاسکتا ہے۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے غسل کیا، تب انھوں نے صحیفہ ان کے ہاتھوں میں دیا، اور حضرت عمرؓ نے اُسے پڑھا۔ (سیرت ابن ہشام جلد اوّل ص ۳۶۷)

(ہ)، اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ ہم آنحضرتؐ کے پاس بیٹھ کر قرآن نقل کیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ "اس دوران کہ ہم حضورؐ کے ارد گرد حلقہ باندھ کر (قرآن) لکھ رہے تھے.... الخ" (دارمی۔ باب من رخص فی کتابتہ العلم ص ۶۹)

حضرت علیؓ نے ایک بار ایک سوال کے جواب میں اس بات کی وضاحت کی کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب کے، اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے، اس کے سوا اور کوئی لکھی ہوئی چیز نہیں۔ (بخاری)

حضرت زیدؓ بن ثابت کا ارشاد ہے کہ ہم خدمتِ نبوی میں بیٹھ کر (چمڑے وغیرہ کے) مختلف ٹکڑوں سے (آپؐ کے حسبِ ہدایت) قرآن مرتب کیا کرتے تھے۔" (بخاری، فضائل القرآن)

یہ سارے واقعات اور حقائق اس امر کا واضح فیصلہ ہیں کہ قرآن مجید کی کتابت کا دوگونہ اہتمام تھا، ایک سرکاری، دوسرا عوامی۔ ایک طرف تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اہتمام میں وہ پورے التزام کے ساتھ برابر لکھا جاتا رہتا تھا دوسری طرف عام مسلمانوں کو اس کی ترغیب و ہدایت تھی کہ ان میں سے جو لکھنا جانتے ہیں وہ بطور خود بھی اسے لکھتے اور نقل کرتے جائیں، اور اس ہدایت پر پورا پورا عمل ہو رہا تھا۔ جب مکے میں بھی، جہاں مسلمان انتہائی پریشانی اور بے مائیگی کی حالت میں اور بہت تھوڑی تعداد میں تھے، لوگ قرآن کریم کو لکھتے رہتے تھے (جیسا کہ حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا واقعہ سے معلوم ہوتا ہے) تو مدنی دور کے بارے میں کچھ

کہنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی، جہاں مسلمان اپنی تعداد، اپنی جمعیتِ خاطر اور اپنے ذرائع کے اعتبار سے ترقی کرکے کہیں سے کہیں جا پہنچے تھے۔ چنانچہ ابھی آپ نے سُنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد لوگ حلقے باندھ کر بیٹھتے تھے، اور اپنے لیے قرآن کے نسخے تیار کرتے تھے۔ اس طرح کتنے ہی صحابہؓ ایسے تھے جنہوں نے حضورؐ کی زندگی ہی میں پورا قرآن، اس کی آخری تدوین کے مطابق لکھ لیا تھا حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت زیدؓ بن ثابت، اور حضرت ابو زید رضی اللہ عنہم کے بارے میں تو حضرت انسؓ نے صراحت سے فرمایا ہے کہ ان حضرات نے عہدِ نبوی ہی میں پورا قرآن جمع کر لیا تھا۔ (بخاری۔ فضائل القرآن) ایسے اصحاب کل کتنے رہے ہوں گے جنہیں یہ سعادت حاصل ہوئی تھی؟ اس کا اندازہ صرف اسی بات سے لگا لیجیے کہ وفاتِ رسولؐ کے ایک سال بعد ہی یمامہ کی جو لڑائی ہوئی تھی اس میں ستر جامعینِ قرآن شہید ہوئے تھے۔ (مرقاۃ۔ بحوالہ حاشیہ بخاری، فضائل القرآن)

غرض اس میں ذرا شک نہیں کہ قرآنِ کریم زمانۂ نبوت ہی میں پورے کا پورا لکھا جا چکا تھا اور وفاتِ رسولؐ کے وقت اس کے نسخے کافی تعداد میں پھیل چکے تھے۔ ایسا ہرگز نہ تھا کہ مسلم معاشرہ لکھے ہوئے قرآن سے خالی رہا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں جب یہ فرمایا کہ "لوگو! وہ زمانہ آنے سے پہلے جب کہ علم (قرآن)، اٹھا لیا جائے، اسے حاصل کر لو" تو ایک اعرابی نے کہا "علم کس طرح اٹھا لیا جائے گا، حالانکہ 'مصاحف'، (یعنی لکھے ہوئے قرآن) ہمارے اندر موجود ہیں"؟ (مسند احمد جلد ۵ صـ ۲۶۶) یہ اس امر کی صریح شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حینِ حیات ہی قرآن کے نسخے عام طور سے تیار ہو چکے تھے، اور اعرابیوں (دیہاتیوں) تک پہنچ چکے تھے۔ آخر میں ایک اور حقیقت پر بھی نظر ڈال لیجیے۔

قرآن مجید نے اپنے کو جا بجا 'کتاب'، کہا ہے، مثلاً ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (یہ کتابِ الٰہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں)، اسی طرح 'صُحُف'، بھی فرمایا ہے۔ جیسے رَسُولٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (سورہ بیّنہ) (اللہ کی طرف سے آیا ہوا ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہے)، پھر اس نے اپنے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ "اسے صرف پاک لوگ ہی چھوتے (یا چھو سکتے ہیں)" (لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ)

(سورۂ واقعہ) اور یہ کہ "وہ بزرگ اور نیکوکار لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے" (بِاَيْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ط) (سورۂ عبس)

یہ ارشادات اس بات کا واضح اعلان ہیں کہ خود قرآنِ حکیم نے اپنی نوعیت ایک ایسے ہدایت نامے کی بتائی ہے جو بنیادی طور پر تحریری حیثیت کا بھی مالک ہے۔ اور جس کے خارجی وجود کے ساتھ کتابت شدہ ہونے کا تصوّر لازم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ نے قرآن کو لکھتے رہنے کا جو اہتمام کیا تھا وہ صرف دینی شغف کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس بات کا بھی نتیجہ تھا کہ قرآن کی مکمل حیثیت نے ان سے اس کام کا تقاضا کیا تھا، اور پوری طرح "موجود" نہیں قرار پا سکتا تھا اگر اسے تحریر کا لباس بھی نہ پہنا دیا جاتا۔

کتابتِ قرآن کے متعلق یہ ساری تفصیلات آپ کے سامنے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے بعد تسلیم ہی نہیں یقین کرنا پڑے گا کہ عہدِ نبوت میں قرآن کریم کی حفاظت تحریری شکل میں بھی ہوئی، وسیع پیمانے پر ہوئی۔ اور مکمل طور سے ہوئی۔

اب رہا بعد کے زمانوں کا سوال، تو شاید یہ ایسا سوال ہوگا جسے صرف بلاضرورت ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ خلفائے راشدین نے اس امانت کی حفاظت اور اشاعت کا جو اہتمام کیا تھا "وہ تدوینِ قرآن" کی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ خاص حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زیرِ سرکردگی قرآن مجید کی نقلیں تیار کرانے اور سارے مسلم علاقوں میں انہیں بھجوانے کا جو انتظام کیا تھا وہ بھی آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی کسی اظہار و بیان کی محتاج نہیں کہ بعد کے زمانے اسلام کی برق رفتار ترقی کے زمانے تھے، اس کا اقتدار اور اس کے ذرائع روز بروز وسعت اختیار کرتے جا رہے تھے، اور اس کے دائرے میں علمِ کتابت کے جاننے والوں کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں سے بھی اوپر پہنچتی جا رہی تھی، اور سب سے آخری بات یہ کہ پوری اسلامی مملکت کا، جو خلفاء راشدین ہی کے زمانے میں عرب سے آگے بڑھ کر عراق، شام اور ایران وغیرہ ملکوں تک وسیع ہو چکی تھی، آئین و قانون بنیادی

طور پر بھی قرآن تھا۔ یہ پوری صورتِ حال اپنی زبان سے جو کچھ کہہ رہی ہے اُس کے سُننے سے یقیناً بہرے کان بھی بے بہرہ نہیں رہ سکتے۔ علاّمہ ابنِ حزم کا اندازہ یہ ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس قرآن کریم کے ایک لاکھ نسخوں سے کم نہ رہے ہوں گے۔ (کتاب الفصل جلد ۲ ص ۷۸) ظاہر بات ہے کہ جس قرآن کی اہمیت یہ تھی کہ اسی پر آخرت کی فلاح اور مملکت کا نظم ونسق سب کچھ منحصر تھا، کوئی بھی مسلم بستی اس کے نسخوں سے خالی کیسے رہ سکتی تھی؟ خصوصاً اس عظیم مملکت کے بے شمار حکام اور قاضیوں کے پاس تو قرآن مجید کے نسخوں کا موجود نہ رہنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان کے منصبی فرائض کی انجام دہی کے لیے اس کتاب کا ان کے پاس موجود ہونا بہرحال ضروری تھا۔ قیاس تو یہ کہتا ہے کہ خود حکومت کی طرف سے انہیں یہ نسخے مہیا کیے جاتے رہے ہوں گے چنانچہ تاریخی طور پر یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ خلفائے راشدین اپنے گورنروں اور قاضیوں کو جو ہدایتیں بھیجا کرتے تھے وہ بھی تحریری شکل میں ہوا کرتی تھیں۔ پھر یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ جو چیز پوری ملت کے لیے اصل ہدایت اور پوری مملکت کے لیے بنیادی قانون کی حیثیت رکھتی تھی اس کے بارے میں وہ اس طرح کے انتظام کی ضرورت نہ محسوس کرتے رہے ہوں گے!

اس پوری بحث سے یہ حقیقت دوپہر کے سورج کی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت دونوں طریقوں سے کی گئی، اور پورے اہتمام سے، انتہائی قابلِ اطمینان حد تک کی گئی۔ اسے کافی وسیع پیمانے پر، اپنی اصل شکل میں لفظاً بہ لفظاً یاد بھی رکھا گیا، اور لکھا بھی گیا، اور عہدِ نبوی کے بعد یہ دونوں سلسلے نہ صرف یہ کہ قائم رہے، بلکہ نہایت تیزی سے ترقی بھی کرتے چلے گئے۔ اس طرح اللہ کی یہ کتاب پورے تواتر کے ساتھ نقل ہوتی ہوئی ہم تک ٹھیک اسی حالت میں پہنچتی چلی آئی ہے جس میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسولؐ کو مرحمت فرمائی گئی تھی۔ جو شخص بھی سچائی کا اعتراف کرنا جانتا ہوگا وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جسے اپنی حفاظت کے لیے ابتداء سے آج تک ایسے قابلِ اطمینان اہتمامات میسّر آئے ہوں،

جو بے شمار سینوں میں بھی اور لاتعداد سفینوں میں بھی مبہم نقش چلی آتی ہو۔ چنانچہ جن غیر مسلم محققین نے اس مسئلہ کا صاف ذہن کے ساتھ جائزہ لیا ہے، انہیں بھی اس کا اعتراف ہے۔ جرمن عالم دان ہیم کا یہ کہنا کہ "ہم قرآن کو محمدؐ کا کلام یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔" اسی امرِ واقعی کی ایک واضح شہادت ہے۔

(ب) قرآنی دلائل

قرآن کریم کے وہ بیانات، جن سے صراحتہً ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ محفوظ رہنے والی کتاب ہے، یہ ہیں:-

(۱) حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ:-

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰٓ ○ (سورۂ اعلیٰ)

ہم تمہیں (یہ قرآن)، اس طرح پڑھادیں گے کہ (وہ تمہیں پوری طرح یاد ہو جائے گا اور) تم اُسے نہ بھولوگے۔

اس ارشادِ خداوندی کا پسِ منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کی اہم اور بھاری ذمہ داریوں کا، قدرتی طور پر، بڑا شدید احساس رہا کرتا، ہر وقت اس فکر سے مضطرب رہتے کہ کہیں اس پیغام وہدایت کا کوئی حصہ اللہ کے بندوں تک پہنچنے سے رہ نہ جائے، جو اس کی جناب سے میرے اوپر اسی لیے نازل ہو رہا ہے کہ اُسے جوں کا توں اُن تک پہنچا دوں۔ یہی احساس تھا جس کے تحت آپ وحیِ قرآنی کے نازل ہوتے وقت اُسے یاد کر لینے کے معاملہ میں بڑی بے چینی اور عجلت کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ پریشان ہونے اور عجلت سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہیں، خاطر جمع رکھو۔ یہ ہماری وحی اور ہماری تعلیم ہے، جس طرح ہم اسے تم تک قابل اطمینان طریقے سے پہنچا رہے ہیں، اسی طرح اسے تمہیں اچھی طرح یاد بھی کرادیں گے اور اس کا کوئی لفظ بھی تمہاری یادداشت سے آزاد نہ ہونے پائے گا۔

یہی اطمینان ایک دوسرے موقع پر ایک اور انداز میں دلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ؕ (قیامۃ)

اے پیغمبر! اس (قرآن) کو حاصل کرتے وقت اپنی زبان کو (اس غرض سے بےتابی کے ساتھ) حرکت نہ دینے لگو کہ اسے جلدی سے سیکھ لو۔ یقین رکھو، اس کا اکٹھا کر دینا اور اسے پڑھ (کر تمہیں سنا) دینا ہمارے ذمّہ ہے۔

اس ارشادِ الٰہی نے اس امر کو اور زیادہ واضح اور قطعی بنا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم اور حافظے سے قرآن کا کوئی ایک لفظ بھی باہر نہ رہ سکے گا، کیونکہ اس بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف وعدہ ہی نہیں ہے (جیسا کہ پچھلی آیت سے معلوم ہو رہا تھا)، بلکہ اسے اس نے اپنی ذمہ داری بھی قرار دے رکھا ہے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اللہ رب العزت کسی بات کو اپنی ذمہ داری قرار دے لے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سورج کا پچھم سے نکلنا تو ممکن ہے، مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اللہ جلّ مجدہٗ اپنی ذمّہ داری پوری نہ کرے۔ اس لیے اس کا یہ فرمانا کہ "اس قرآن کا اکٹھا کر دینا اور اُسے پڑھ کر سُنا دینا ہمارے ذمہ ہے"، اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں قرآنِ کریم پوری طرح محفوظ رہا اور ٹھیک اسی شکل میں محفوظ رہا جس میں کہ وہ آپ کو عنایت کیا گیا تھا۔

(۲) قرآن مجید کی صفت اس کے نازل کرنے والے نے یہ بتائی ہے:۔

اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حم سجدہ)

یقیناً یہ ایک کتاب عزیز ہے، باطل نہ اس کے آگے سے اس میں راہ پا سکتا ہے، نہ اس کے پیچھے سے۔

"عزیز" کے معنی ہیں "وہ جس کے خلاف کوئی طاقت کامیاب نہ ہو سکے"، اس لیے قرآن کے "کتابِ عزیز" ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے وجود کو کبھی کوئی خرابی لاحق نہیں ہو سکتی، اس کی حُرمت پر کوئی شے اثر انداز نہیں ہو سکتی، اور اس کی ہیئت اور حیثیت کسی بھی تغیّر کی دسترس سے یکسر بالاتر ہے۔ چنانچہ آگے اسی "عزیزیت" کی تشریح کرتے ہوئے صراحت

کردی گئی ہے کہ باطل اس کے اندر گھس آنے کی راہ نہ پا سکے گا، کسی کتابِ الٰہی کے اندر باطل کے گھس آنے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کوئی انسانی کلام مل جائے یا اس کے الفاظ وعبارات اُلٹ پلٹ ہوجائیں، یا اس کا کوئی حصّہ ضائع ہوجائے کیونکہ ان شکلوں میں سے جو شکل بھی ہو اس کے پیش آجانے کے بعد کتاب اپنی اصل نازل شُدہ حالت میں باقی نہیں رہ جاتی، اور اس پر مکمل اور خالص حق ہونے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے قرآن مجید کے اندر باطل کے راہ نہ پا سکنے کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ اس کتاب میں نہ کبھی کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے، نہ اس کے الفاظ آگے پیچھے ہو سکتے ہیں، اور نہ اس کی حالت میں کسی طرح کا کوئی اور تغیّر پیدا ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کے بارے میں یہ قادرِ مطلق خدا کا وعدہ ہے، ایسا وعدہ جس میں فرمان کی سی شان پائی جاتی ہے۔ اس وعدے یا فرمان کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے نہ تو مخصوص طور پر صرف اپنے رسولؐ ہی کو سامنے رکھا ہے۔ نہ اس میں زمانے کی کوئی قید لگائی ہے، بلکہ بات اصولی انداز میں فرمائی ہے۔ اس لیے اس کا یہ ارشاد اس امر کا اعلان ہے کہ قرآنِ مجید میں کبھی کوئی آمیزش نہ ہو سکے گی، کبھی اس کا کوئی جزو ضائع نہ ہو سکے گا، کبھی اس کے الفاظ میں کوئی تقدیم وتاخیر نہ ہو سکے گی، جب کہ پچھلی دونوں آیتوں میں یہ وعدہ یا فرمان صرف ذاتِ رسولؐ ہی کی حد تک محدود تھا۔

(۳) ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿﴾	بے شبہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم ہی نے نازل کیا ہے، اور ہم یقیناً اسے محفوظ رکھیں گے۔
(سورۂ حجر ۹)	

یہ الفاظِ خداوندی کسی شرح کے محتاج نہیں، اور ان سے مسئلہ زیرِ بحث کا گوشہ گوشہ آئینہ کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کو ایک صریح حقیقت بنا رہے ہیں کہ اس قرآن کا نازل کرنے والا خدا اسے ہر قسم کے تغیّر اور کمی بیشی سے ہمیشہ محفوظ رکھے گا۔ یہ اس کا وعدہ اور فیصلہ ہے۔ جس کے بعد اس امر کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ کسی

وقت بھی قرآن کا حال وہ ہو سکتا ہے جو پچھلی کتابوں کا ہو نا رہا ہے۔ غرض یہ آیت قرآن کے پوری طرح محفوظ باقی رہنے کے معاملے میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے، اور اسے ہمیشہ کے لیے بحث و تحقیق کی ضرورت سے بالاتر قرار دیتی ہے۔

(۴)، آخر میں ایک استنباطی دلیل بھی دیکھیے :۔ قرآن مجید نے اپنی جو مخصوص حیثیت بنائی ہے اور اپنے جن امتیازی صفتوں کا مالک ٹھیرایا ہے، خود ان کا تقاضا لازمی اور بدیہی تقاضا کیا ہے؟ جو کتاب، اللہ رب العالمین کا آخری ہدایت نامہ ہے، جو پچھلی ساری آسمانی کتابوں کو منسوخ قرار دے چکی ہے، اور جس کی پیروی پر اب پوری انسانیت کی فلاح اور نجات موقوف ہے، کیا عقلِ عام اس کے بارے میں اس امر کو قابل تسلیم قرار دے سکتی ہے کہ وہ بھی کبھی تحریف کی نذر ہو سکتی ہے؟ اُسے بھی کبھی بُھلا دیا جا سکتا ہے؟ اس کے اندر بھی کوئی تغیّر راہ پا سکتا ہے؟ نہیں، اور یقیناً نہیں۔ کیونکہ یہ بات اس کی حیثیت اس کے منصب، اور اس کے مقصدِ نزول سے کسی طرح میل نہیں کھاتی، اور ایسا خیال کرنا دراصل نوعِ انسانی کے خالق پر ظلم اور ناانصافی کا الزام لگانا ہے کہ ایک طرف تو وہ اِس کتاب کو اپنا واحد منظور شدہ ہدایت نامہ ٹھیرا رہا ہے اور اسی کی پیروی کو اپنی رحمت اور مغفرت کی شرط قرار دے رہا ہے، دوسری طرف اپنے بندوں کے لیے اسے اصل حالت میں محفوظ باقی رہنے کا اس نے کوئی خاص اہتمام بھی نہیں فرمایا، گویا وہ اپنے بندوں کو اس "جرم" میں سزا دے گا کہ انہوں نے اس کے ایک خاص قانون اور ہدایت نامے کی پیروی نہیں کی، حالانکہ وہ خاص قانون اور ہدایت نامہ اپنی صحیح شکل میں دنیا کے اندر باقی ہی نہیں رہ گیا تھا!

قرآن مجید کے محفوظ ہونے کی یہ دلیل اگرچہ اس کے کسی صریح ارشاد پر مبنی نہیں ہے لیکن اس کے بہت سے ان ارشادات کا جن میں اس نے اپنی مخصوص اور امتیازی صفات کا اظہار کیا ہے، بالکل صریح تقاضا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اندازِ بیان

اَندازِ بَیان کی نُدرت

قرآن مجید نہ صرف یہ کہ ایک اعلیٰ اور بلیغ کلام ہے جس کی انسانی کلام کے پورے ذخیرے میں کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کا انداز بیان بھی بالکل اچھوتا ہے، جو کسی دوسری کتاب میں ہرگز نہیں پایا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اُس سے اور اس کے اسباب و مصالح سے واقف نہ ہو جائے، اس پر قرآنِ حکیم کے عام مطالب بھی پوری طرح نہیں کھل سکتے، چہ جائیکہ اس کے محاسن تک اس کی نظریں پہنچ جائیں۔ اس لیے قرآن مجید سے متعارف ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندازِ بیان کی اس مخصوص نوعیت کو بھی، کم ازکم بنیادی طور سے لازماً سمجھ لیا جائے

عام کتابوں اور تصنیفوں کا اندازِ بیان تو یہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو مسلسل اور ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے۔ پہلے صراحت کے ساتھ مرکزی موضوع کا تعین ہوتا ہے، پھر اس کے مختلف پہلوؤں اور مسئلوں میں سے ایک ایک کو لے کر اس پر تفصیلی بحث ہوا کرتی ہے، اور جب تک ایک مسئلہ پر پوری بحث نہیں ہو لیتی دوسرے کا نام نہیں آتے پاتا۔ لیکن قرآنِ حکیم میں نہ تو اس طرح موضوع کا تعیّن اور عنوان کی صراحت ہے، نہ کہیں ابواب کی تقسیم نظر آتی ہے۔ نہ مختلف مسئلوں پر کی جانے والی گفتگوؤں میں کوئی تدریج اور ترتیب دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اس میں فی الواقع سب کچھ ہے، پورے قرآن کا ایک جامع،

اور ہر سورۃ کا ایک ذیلی مرکزی مضمون بھی ہے، ہر مضمون کے متعدد مسئلے اور گوشے بھی ہیں، اور پھر ان سب پر الگ الگ گفتگوئیں ہیں — اور ان گفتگوؤں میں گہرا ربط بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب بظاہر خلط ملط نظر آتے ہیں۔ بنیادی عقائد، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت و نصیحت، ترغیب و تسلی، زجر و ملامت، وعید اور عذاب، بشارت اور ثواب، نیز عقل، وجدان، فطرت، تاریخی شواہد اور آثار کائنات سے استدلال بار بار ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف جگہوں پر مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، بظاہر بالکل اچانک شروع ہو جاتا ہے۔ پھر خطاب بھی رہ رہ کر بدل جاتا ہے۔ مخاطب دیکھتے دیکھتے غائب بن جاتا ہے، اور غائب مخاطب، متکلّم یکایک غائب کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور غائب متکلّم کے لباس میں آ نمودار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو بحث بھی ہے وہ معروف انداز سے بہت کچھ مختلف رنگ میں ہے۔ عقائد کا بیان ہے تو فلسفہ و کلام کے انداز میں نہیں، اخلاق کی تعلیم ہے تو علم الاخلاق کے اسلوب میں نہیں، ردّ و اثبات ہے تو فنِ مناظرہ کے طرز پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت پر گفتگو ہے تو علوم و عمرانی کے ڈھنگ پر نہیں، قانون اور اصولِ قانون کا تذکرہ ہے تو مقنّنوں کے طریقے سے بالکل مختلف، اور تاریخی واقعات کا بیان ہے تو تاریخ نگاری کے نہج سے یکسر جدا۔ غرض ہمارے ذہن بحث و استدلال اور تعلیم و تفہیم کے جن تصنیفی، تدریسی اور تقریری اسالیب سے مانوس ہیں، قرآنِ حکیم کا اسلوب بیان ان سب سے جدا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مرتب اور مربوط کلام نہیں بلکہ بے ربط جملوں اور منتشر شذروں کا مجموعہ ہے۔ لیکن حقیقت واقعی اس کے بالکل برعکس ہے، اور اس کے اندر غایت درجہ گہرا ربط اور حکیمانہ نظم کار فرما ہے۔ لیکن اس ربط و نظم کو پا لینے کے لیے ضروری ہے کہ ذہن سے ان تصنیفی اور تقریری سانچوں کو نکال دیا جائے جو عام کتابوں کے پڑھتے رہنے یا تعلیمی لکچروں کے سنتے رہنے

سے ہمارے ذہنوں میں پیدا ہو چکا ہے، اور پھر ایک نیا نقطۂ نظر لے کر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے، یہ نیا نقطۂ نظر، مصنوعی طور پر نہیں اختیار کیا جا سکتا، بلکہ قرآنی اسلوب بیان کی ندرت کے فطری اسباب اور اہم ترین مصالح سے واقف ہو جانے پر وہ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔

ندرتِ بیان کے اسباب

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان عام کتابوں سے جن وجوہ کی بنا پر مختلف ہے، وہ بنیادی طور پر یہ ہیں:۔

(۱) قرآن مجید 'مضامین' کا نہیں، بلکہ 'خطبوں' کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کے اندر کتابی اور تصنیفی اندازِ بیان کے پائے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قدرتی طور پر اس کا اندازِ بیان صرف خطابی ہی ہو سکتا تھا، اور خطابی ہی ہے

(۲) یہ خطبے بھی کسی واعظ کے وعظ یا کسی پروفیسر کے لکچر نہیں، بلکہ ایک داعی کے خطبے ہیں، ایسے داعی کے خطبے جو انسانوں کے بیچ میں کھڑا ہو کر انہیں غلط راہوں سے ہٹانے اور سیدھی راہ کی طرف لانے کے لیے کوشاں ہے۔ اس لیے اس کی خطابت کا اسلوب بھی واعظانہ یا تدریسی نہیں بلکہ سر تا سر دعوتی ہے۔

(۳) وہ دعوت، جس کے سلسلے میں یہ خطبے دئے گئے تھے، اپنے نقطۂ کمال کو تیئیس ۲۳ سال کی لمبی مدّت میں، اور مختلف حالات اور مراحل سے گزرتی ہوئی پہونچی تھی اس لیے یہ خطبے نہ تو چند مہینوں کے معمولی عرصے میں اور مسلسل دیے گئے تھے، نہ تقریباً ایک سے حالات میں دیے گئے تھے اور نہ ایک ہی جیسے لوگوں کو سامنے رکھ کر دئے گئے تھے، بلکہ صورتِ واقعہ ٹھیک اس کے برعکس تھی۔

ان تینوں باتوں کا جو تقاضا تھا اس پر اچھی طرح غور کیجیے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دعوتی خطاب کے تقاضے تصنیف و تالیف، وعظ و نصیحت، اور درس و تقریر، سبھی کے تقاضوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ایک داعی اپنے خطاب

میں ایک مصنّف یا پروفیسر کا سا طرز اختیار کرلے تو اس کا کلام بے مزہ، بے اثر اور کانوں کو سخت ناگوار ہوگا۔ اسی طرح اگر وہ صرف ایک واعظ کی سی پوزیشن اختیار کرلے تو اپنی دعوت کے انقلابی مقاصد کبھی حاصل نہ کرسکے گا۔ بلاشبہ مصنّف یا پروفیسر کا کلام بھی سائنٹفک یا استدلالی ہوتا ہے اور داعی کا کلام بھی۔ مگر مصنّف یا پروفیسر کی بحث خالص نظری ہوتی ہے، جب کہ خطیب کی گفتگو بنیادی طور پر فطری اور نفسیاتی ہوتی ہے، بالخصوص اس خطیب کی جو داعی بھی ہو۔ ایسے خطیب کا کام صرف یہی نہیں ہوتا کہ ایک مصنّف کی طرح اپنے افکار کو زیورِ استدلال اور حُسنِ بیان سے آراستہ کرکے سیاہ نقوش میں منتقل کردے، یا ایک پروفیسر کی طرح کسی علمی نظریے کو کچھ ہم سطح ذہنی استعداد رکھنے والے طلبہ کے دماغوں میں تفصیلی دلائل کے ساتھ اتار دے، یا ایک واعظ کی طرح دلوں میں رقت اور گُداز پیدا کردے۔ اس کے بخلاف اس کا کام قطعی طور پر کہیں زیادہ بلند اور دشوار ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس کے سامنے مختلف ذہنیتیں اور مختلف استعدادیں رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں، شہری اور دیہاتی، تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ، سلیم الفطرت اور کج طبع، وحی و رسالت کے ماننے والے اور اُن کے مُنکر، توحید شناس اور اہلِ شرک ہر طرح کے لوگوں کو اُسے شاہراہِ حق کی طرف بلانا ہوتا ہے۔ دوسری طرف ساتھ کے ساتھ، اُسے اُن لوگوں کی ذہنی اور عملی تربیت کا حکیمانہ فرض انجام دینا اور اُنہیں دینی احکامات وہدایات سکھانا ہوتا ہے جو اس کی دعوت پر ایمان لاچکتے ہیں۔ "شاہراہِ حق کی طرف بلانے" کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے کہ اپنی بات کو عقل و منطق کی ترازو میں تول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے، بلکہ یہ بھی ہوتے ہیں کہ اسے دلوں میں اتار دینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور اس غرض سے پہلے اُن کے اندر مدّتوں کے جمے ہوئے باطل نظریات کو اکھاڑ پھینکا جائے، اور غلط مگر انتہائی نازک جذبات کی گرفت سے اُنہیں آزاد کرالیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے خاص قسم کا دل و دماغ ہی نہیں خاص قسم کی زبان بھی درکار ہے۔ باطن کا نور اور استدلال کا زور ہی نہیں بیان کا سحر بھی ضروری ہے۔ اور یہ سحر، داعی کے کلام میں پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی تیز نگاہیں

مخاطب کے افکار کا، اس کے رجحانات کا، اس کی نفسیات کا کامیاب تعاقب نہ کرتی رہیں، اور وہ اُن ہی کے حسبِ حال کبھی استدلال کا اور کبھی نصیحت کا، کبھی ترغیب کا اور کبھی ترہیب کا، کبھی حسرت کا اور کبھی غضب کا، کبھی شفقت کا اور کبھی نفرت کا انداز نہ اختیار کرتا رہے، اور اس غرض کے لیے وہ رہ رہ کر خطاب بھی نہ بدلتا رہے۔ اسی طرح دعوت پر ایمان لا چکنے والوں کی ذہنی اور عملی تربیت کا اور انہیں دینی احکام اور ہدایات دینے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ ان کے ہاتھوں میں نصائح اور قوانین کا مجموعہ دے دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ پوری حکمت اور دیدہ وری کے ساتھ ان کی زندگیوں کو دعوت کے مطلوبہ سانچے میں تدریجاً ڈھالتے رہا جائے۔ اور یہ مقصد اس وقت تک ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا جب تک کہ داعی احکام کے نظری پہلوؤں سے آگے بڑھ کر ماحول کے تقاضوں، حالات کی مناسبتوں، لوگوں کی ذہنی کیفیتوں اور ان کی قلبی آمادگیوں کا بھی پوری طرح لحاظ نہ رکھے، اور اُن ہی کے مطابق اُن سے ہم کلام نہ ہو ــــ اب یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہوگا کہ دوسرے کسی شخص کو کلام کرتے وقت اس طرح کی باتوں سے کوئی سابقہ ہی نہیں ہوتا، اور جب حقیقت یہ ہے تو ضروری ٹھیرا کہ داعی کا اندازِ بیان بھی اپنی نوعیت کا ایک ہی اندازِ بیان ہو۔

قرآنِ مجید دعوتی خطبوں کا مجموعہ ہے۔ اصل خطیب کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ سارے بنی آدم اس کے مخاطب ہیں۔ فرشتۂ وحی (حضرتِ جبرئیل) اور صاحبِ وحی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) واسطے اور ترجمان کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی قرآن نام ہے ان خطبوں کا جو فرمانروائے کائنات نے اپنی زمینی رعایا کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے ہیں۔ اس لیے اس کے اندازِ بیان میں وہی سب باتیں لازماً موجود ہیں جن کی طرف ابھی اشارے کیے گئے۔ قدرتی طور پر اس کے اندر حسبِ مواقع گرمی بھی ہے اور نرمی بھی، وعیدیں بھی ہیں اور بشارتیں بھی، دلائل بھی ہیں اور نصائح بھی، ترغیبیں بھی ہیں اور ترہیبیں بھی، پیار کے بول بھی ہیں اور غیظ و غضب کے کڑکے بھی۔ پھر ان ہی باتوں کے حسبِ تقاضا خطاب بھی برابر بدلتا گیا ہے۔ مثلاً جو ابھی

حاضر، اور مخاطب تھا، اسے یکایک غائب قرار دے دیا گیا ہے۔ گویا خطیبِ دعوت نے اُس کی غفلتوں اور جسارتوں کا رویّہ دیکھ کر غصہ اور نفرت کے مارے اس کی طرف سے اپنی نگاہیں ہٹالی ہیں اور اب اُس سے رُو در رُو گفتگو کرنے کا روادار نہیں رہا۔ یا مثلاً اصل 'متکلم' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بھی جگہ جگہ 'غائب' ٹھیرادیا ہے اور درمیانی واسطے فرشتہ، وحی یا صاحبِ وحی، کو اپنی جگہ متکلم بنادیا ہے، کہ کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بالواسطہ کہنے ہی میں لُطف واثر ہوتا ہے۔ اسی طرح کتنے ہی مقامات پر تو اس نے اصل مخاطب کو متکلم اور خود کو مخاطب بنا دیا ہے۔ یہ گویا اس کی طرف سے اسے اس امر کی تلقین ہے، یا پھر اس کی فطرت کی ترجمانی، کہ اُسے اپنے پروردگار سے یوں عرض گزار ہونا چاہیے۔ پھر یہ بھی دعوتی خطاب ہی کا تقاضا تھا کہ قرآنِ مجید میں بے شمار مواقع پر ایک بحث کے بعد یکایک دوسری بحث شروع ہو گئی ہے۔ جس کا بظاہر پہلی بحث سے کوئی ربط دکھائی نہیں دیتا۔ ابھی توحید پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک آخرت اور جزائے عمل کا ذکر آ گیا، قرآن اور نبوّت کی صداقت پر دلائل دئے جا رہے تھے کہ معًا منکرینِ حق کی دنیا پرستیوں پر تبصرہ ہونے لگا، مشرکینِ عرب کی حجّت بازیوں کا تذکرہ تھا کہ اہلِ کتاب کی قساوتوں اور خدا بیزار حرکتوں کا بیان شروع ہو گیا۔ قرآن مجید کو ایک کتاب اور ایک تصنیف خیال کر کے دیکھیے تو کچھ نہ سمجھ میں آئے گا کہ یہ کیا اندازِ بیان ہے؟ لیکن اگر ایک داعی کے مقام پر کھڑے ہو کر دیکھیے، اور آپ کے سامنے وہ پورا پس منظر بھی ہو جو اس کلامِ ربّانی سے تعلق رکھتا تھا، تو اس کی ایک ایک بات اپنی جگہ ویسی ہی موزوں نظر آئے گی، جیسا کہ انگشتری میں نگینہ ہوا کرتا ہے۔

تکرارِ مضامین

قرآنِ کریم کے اندر مباحث اور مضامین کی بکثرت تکرار ہے۔ کتنے ہی احکام و ہدایات، وعیدیں اور بشارتیں، تنبیہیں اور نصیحتیں، دلائل و شواہد، اور

تاریخی واقعات ایسے ہیں جو جگہ جگہ مذکور ہیں۔ جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں خود کہا ہے کہ:۔

کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ الخ (سورۂ زمر ۲۳)

ایک ایسی کتاب جس کے مضامین آپس میں ملتے جلتے اور بار بار دُہرائے ہوئے ہیں،

بظاہر یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں، اور ایک ناواقف انسان کے ذوق پر مضامین کی یہ تکرار بڑی گراں گزرے گی، لیکن قرآن حکیم کے طریقِ نزول اور مقصدِ نزول، دونوں ہی امور کا قطعی تقاضا تھا کہ یہ مضامین اسی طرح بار بار دُہرائے جاتے:۔

طریقِ نزول کا تقاضا اس لیے تھا کہ قرآن مجید جب ایک عملی اور ارتقائی دعوت کے ساتھ ساتھ نازل ہو رہا تھا، جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے معلوم ہو چکا، تو ضروری تھا کہ دعوت جس وقت تک جس مرحلے میں تھی اس وقت تک صرف وہی ہدایتیں ارشاد فرمائی جاتیں جو اس مرحلے سے مناسبت رکھتی تھیں، اور دوسرے مراحل کی باتیں بالکل نہ چھیڑی جاتیں، بلکہ اسی مرحلے کی باتوں کا حسب ضرورت اعادہ ہوتا رہتا خواہ اس میں کتنی ہی مدت کیوں نہ گزر جاتی۔

مقصدِ نزول کا تقاضا اس لیے تھا کہ کوئی بھی دعوت اسی وقت کامیاب ثابت ہو سکتی ہے جب اس کے پیرووں کے دل و دماغ میں اس کی بنیادیں پوری مضبوطی سے جم گئی ہوں، اور پھر ان کی برابر نگہداشت بھی ہوتی رہے ورنہ قیاس اور تجربہ، دونوں کا فیصلہ ہے کہ دعوت اپنی منزلِ مقصود کو ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے دعوتِ قرآنی کے مقاصد کی تکمیل بھی مطالبہ کرتی تھی کہ اس کی بنیادی تعلیمات کو پہلے دن سے آخری وقت تک کسی موقع پر اور کسی حال میں بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے، اور دعوت کے ہر مرحلے میں ان کا بار بار اعادہ ہوتا اور ان کی مسلسل تلقین و تذکیر ہوتی رہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید کے اندر دوسرے مضامین کی تکرار تو کسی ایک خاص مرحلے ہی تک محدود ہے، لیکن توحید، آخرت، جزا و سزا، رسالت، طاعت و بندگی،

برّ و تقویٰ، صبر و شکر، توکل و انابت، نماز و انفاق اور صلہ رحمی وغیرہ امور کے تذکروں سے قرآن کا کوئی صفحہ خالی نہیں، اور ان کی تلقینات اس کے اندر ہر سمت اس طرح پھیلی ہوئی ہیں جس طرح جسمِ انسانی میں رگیں پھیلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ دین کی بنیادیں تھیں، اور انہی کی مضبوطی پر پورے دین کی مضبوطی موقوف تھی۔

لیکن "تکرار" کے لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ایک ہی بات کو، لفظاً و معناً، جوں کا توں جگہ جگہ دُہرا دیا گیا ہے۔ نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس کے باوجود کہ ایک ہی حکم، ایک ہی قصّے اور ایک ہی استدلال کو دسیوں بیسیوں مقامات پر بیان کیا گیا ہے ..... تکرارِ محض کہیں بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر مقام پر تذکیر و تفہیم کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک ہی قصّے کو اجمال و تفصیل کی مختلف حدوں میں بیان کرتا ہے واقعات کی ترتیب اور بیان کے طرز میں تنوع پیدا کر دیتا ہے الفاظ کو بدل دیتا ہے قصّے کے مختلف اجزاء میں سے کسی کو کہیں اور کسی کو کہیں حذف کر دیتا ہے۔ ان باتوں سے جہاں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کو ایک ہی عبارت اور ایک ہی اسلوب میں سنتے سُنتے طبیعتوں میں ناگواری نہیں محسوس ہوتی، جی اُکتا اور کان تھک نہیں جاتے، وہاں اس سے بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تذکیر یا استدلال کے پہلو بدل جاتے ہیں اور حکمتِ الٰہی کے کچھ نئے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں، جس سے سُننے سمجھنے والوں پر ہر بار ایک نیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس طرح قصوں کی یہ تکرار، تکرار ہے بھی اور نہیں بھی۔ اسی پر احکام کی تکرار، دلائل کی تکرار، نصائح کی تکرار اور دوسرے مضامین کی تکرار کو بھی قیاس کر لیجیے۔ یہاں صرف یہی نہیں ہے کہ ایک ایک مضمون کو سو سو رنگ سے باندھا گیا ہے، بلکہ ان میں سو سو حکمتیں اور دعوتی افادیتیں بھی سمو دی گئی ہیں۔

اب جو شخص بھی ان مصالح کی اہمیت کا جائزہ لے گا جو قرآن کے اندر تکرارِ مضامین کا موجب بنے ہیں، اور پھر اس تکرار کی نوعیت کو بھی سمجھ لے گا، یقین ہے کہ اس کے لیے کسی اعتراض یا احساسِ ناگواری کا کوئی سوال ہی باقی نہ رَہ جائے گا، اور وہ اِس تکرارِ بیان کو قرآن کے محاسنِ کمال میں شمار کرے گا، جیسا کہ خود اس نے کیا ہے، اور اسے اس کی دعوت کے لیے ناگزیر باور کرے گا جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے۔

قرآن اور اجزائے قرآن

قرآن کا تسمیہ

لفظ "قرآن" عربی زبان کا ایک مصدر ہے، اس کے لغوی معنی ہیں "حروف اور کلمات کو بامعنی ترتیب کے ساتھ جوڑ کر زبان سے ادا کرنا، جس کو عام فہم تعبیر میں "پڑھنا" کہتے ہیں۔ پھر عربی زبان کے اس عام ضابطے کے مطابق، کہ مصدر اسم مفعول کے معنی میں بھی آتا ہے، اس لفظ کا اطلاق اس چیز پر بھی ہونے لگا جو پڑھی جائے۔ اس لحاظ سے ہر نوشتے اور ہر کتاب کو، جسے پڑھا جائے، لغت کی رو سے "قرآن" کہہ سکتے تھے۔ لیکن جہاں تک محاورے اور واقعی استعمال کا تعلق ہے، ہر کتاب کے لئے قرآن کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مخصوص طور پر صرف ان ہی کتابوں کی حد تک اس کے استعمال کو محدود رکھا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہوں۔ گویا یہ لفظ اب آسمانی کتابوں کے لئے "اسم جنس" ہوگیا ہے، اور "قرآن" کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب۔

چنانچہ خود قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ اسی معنی میں بولا گیا ہے، مثلاً:-

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ۔ الخ۔ (سورۂ رعد، ۳۱)

اور اگر کوئی ایسا "قرآن" (یعنی آسمانی صحیفہ) ہوتا جس کے ذریعہ پہاڑوں کو چلا دیا جاتا! الخ

یہ تو ہوئے لفظ "قرآن" کے عام معنی و مفہوم۔ اس کے بعد اس لفظ میں مزید خصوصیت آئی۔ اور اس نے ایک خاص اصطلاح کی حیثیت اختیار کر لی۔ جس سے مراد صرف وہ "کتاب الٰہی" رہ گئی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔ اس طرح اب یہ لفظ (شروع میں "ال" کے

اضافہ کے ساتھ، جو عربی زبان میں لفظوں کے معرفہ بنا دینے جانے کی علامت ہے) اسی مخصوص کتابِ الٰہی کا نام اور علم ہو چکا ہے، اور اگر اس بنا پر کہ وہ آسمانی کتابوں کا اسمِ جنس بھی ہے، کسی اور کتابِ الٰہی کے لئے اس کا استعمال ہوا بھی، (جیسا کہ خود قرآن مجید ہی میں ایک جگہ تورات، کو "القرآن"، کہا گیا ہے۔ (دیکھئے سورۂ حجر، آیت ۹۱) تو اس کے لئے واضح قرائن موجود ہوں گے۔

قرآن مجید کو "القرآن" کہے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا یہ نام تجویز کئے جانے کی اصل حکمتیں تو وہی جانتا ہے، لیکن کچھ بعید نہیں اگر یہ وجوہ اور حکمتیں حسبِ ذیل ہوں:۔

(۱)، قرآن انسانی زندگی کا مکمل دستور اور ہمہ وقتی رہنما ہے اس لئے اس کے پیروؤں کا اسکے ساتھ تعلق بھی مکمل اور ہمہ وقتی ہے۔ اس تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کاغذ کے صفحات پر نقش رہنے سے زیادہ اُن کی لوحِ قلب پر نقش رہے، اور زبانیں اس کی تلاوت میں بالعموم مصروف رہیں۔ چنانچہ اس کی حفاظت کا اولین اور بنیادی ذریعہ بھی حافظِ حقیقی کی طرف سے یہی مقرر فرمایا گیا ہے کہ ہر زمانے میں ہزاروں حفاظ کے سینے اس کے امانت دار ہوں گے۔ اور لاکھوں زبانیں اس کے وِرد سے مترنم رہا کریں گی۔ اس لئے اس کتاب کا نام ہی "قرآن" رکھا گیا، یعنی وہ کتاب جو پڑھی جائے اور پڑھی جاتی رہے۔

(۲)، قرآن کے ذریعہ نزولِ ہدایت کا وہ سلسلہ اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا تھا، اور اس کے اندر اب تک کے نازل ہو چکنے والے سارے ہدایت ناموں کی بنیادی تعلیمات جمع اور محفوظ کر دی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلی آسمانی کتابوں میں سے اگر کسی کتاب کی بابت ہم آج یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی اصل تعلیم و دعوت کیا تھی، تو خود اس نام کی کتاب سے ہمیں پوری کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی، اگر یہ کامیابی ہو سکتی ہے تو اسی قرآن کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہ قرآن کہنے کو تو ایک کتاب ہے، مگر فی الواقع پورے سلسلۂ وحی اور ساری آسمانی کتابوں کا جامع ہے۔ اس لئے اس کا نام "قرآن" تجویز فرمایا گیا۔ جس کے اصل لغوی مفہوم ہی میں "جمع" اور اکٹھا کرنے کے معنیٰ موجود ہیں۔

قرآن مجید کے بعض اور نام بھی ہیں، جو اس نے اپنے لئے بکثرت استعمال کئے ہیں۔ مثلاً کتاب، فرقان، ذکر، ذکریٰ، نور، ہدیٰ وغیرہ۔ مگر ان کی حیثیت چونکہ اسمِ ذات، اور عَلَم کی سی نہیں ہے،

جیسا کہ لفظ "قرآن" کی تھی، اس لئے اس بحث میں جانا یہاں کچھ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں، اور قرآنِ حکیم نے اپنے کو یہ نام بھی کیوں دیتے ہیں۔؟

سُورہ

"قرآن مجید" پورا کا پورا، ایک مسلسل مضمون اور بحث کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ وہ ایک سو چودہ حصوں میں بٹا ہوا ہے، جن کی نوعیت ایک کتاب کے ابواب کی سی سمجھیئے، ان اجزائے قرآن کو اللہ تعالیٰ نے "سورہ" فرمایا ہے۔

ہر سورہ کا ایک مستقل موضوعِ کلام ہوتا ہے، جو پورے قرآن کے جامع اور کُلّی موضوع کا ایک جزو ہوتا ہے، یا پھر اس سے تعلق رکھنے والے امور میں سے کوئی خاص امر سورہ کی پوری گفتگو اس کے اسی مرکزی مضمون کے اِرد گرد گھومتی ہے، یہ گفتگو، جیسا کہ چاہیئے ۔۔۔، اپنے مقصد اور موضوع کے مدِّ نظر پوری طرح مکمل ہوتی ہے، اور کسی اور سورہ کی محتاج نہیں ہوتی، ہر سورہ کا مرکزی مضمون پہلے اور بعد والی سورتوں کے مرکزی مضامین سے ایک منطقی اور فطری مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن ان ساری باتوں کو سمجھنے کے لئے بڑی کاوش اور گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کی کوئی وضاحت خود قرآن میں موجود نہیں ہے، اور انہیں ہمارے تفکّر و تدبّر ہی کے لئے چھوڑ رکھا گیا ہے، جیسا کہ دعوتِ قرآنی کی نوعیت کا تقاضا تھا۔

"سورہ" کا لفظ "سُور" سے نکلا ہے، جس کے معنی "شہر پناہ" کے ہوتے ہیں۔ ذہن یہ جاننا چاہے گا کہ ان اجزائے قرآن کو "سورہ" کیوں فرمایا گیا ہے؟ لیکن چونکہ اس بارے میں بھی اللہ تعالیٰ یا اس کے رسولؐ کی طرف سے کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے، اس لئے اس کی وجہ بھی قیاس ہی سے متعین کی جا سکتی ہے۔ غور کرنے سے اس کی دو ہی وجہیں سمجھ میں آتی ہیں:۔

(۱) ایک وجہ تو ان اجزائے قرآن میں سے ہر جزو کی وہ مستقل حیثیت ہے جس کا ذکر ابھی گذرا، یعنی اجزائے قرآن کو "سورہ" کے نام سے تعبیر فرما کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح کوئی شہر اپنی فصیلوں کے ذریعہ اپنی مستقل حیثیت کا اظہار کرتا۔ اور ملک کی دوسری بستیوں سے الگ اور باقی سطحِ زمین سے ممیّز ہو رہتا ہے، اسی طرح قرآن کے ہر جزو

یعنی ہر سورہ کا ایک مستقل عنوانِ گفتگو ہوتا ہے۔ ایک مستقل نظامِ بحث ہوتا ہے۔ ضروری تفصیلات اور ضمنی مباحث ہوتے ہیں، اور اس طرح وہ ایک مستقل اور دوسری سورتوں سے الگ حیثیت کی مالک ہوتی ہے۔ چنانچہ عقل کہتی ہے کہ اگر ہر سورہ کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہ ہوتی تو پورے قرآن کو ایک سو چودہ سورتوں میں تقسیم کر دینے کے بجائے مسلسل ایک ہی مضمون رہنے دیا گیا ہوتا۔

(۲) دوسری وجہ قرآن مجید کی وہ کامل محفوظیت ہے جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ تھا کہ قرآن کو وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے گا، اسلئے اس کے اجزاء و ابواب کو 'سورہ' کے لفظ سے تعبیر فرما کر اس نے دراصل اپنے اسی فیصلہ کا ایک خاص انداز میں اعلان کیا ہے۔ گویا یہ تعبیر یہ بتانے کے لئے اختیار کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم، کلماتِ حق کی ایسی روحانی 'بستیوں' کا مجموعہ ہے جو حفاظتِ غیب کی سنگین فصیلوں سے گھیر کر زمانے کی ہر دستبرد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون کر دی گئی ہیں۔

سورتوں کے نام توقیفی ہیں۔ یعنی یا تو اللہ کے رکھے ہوئے ہیں، یا اس کے رسولؐ کے۔ کئی ایک سورتوں کے ایک سے زائد نام بھی ہیں۔ پھر ان توقیفی ناموں کے علاوہ دوسرے نام بھی ہیں جنھیں اُمت کے اکابر نے مضامینِ سورہ کی نوعیت ظاہر کرنے کے لئے بعد میں خود رکھ لیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ناموں کی حیثیت اصل نام کی نہیں ہے۔ اصل نام تو وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ خصوصاً ہر سورہ کا وہ نام جو عام طور سے معروف ہے، اور قرآن مجید کے نسخوں میں تحریر ہوتا چلا جا رہا ہے، قطعی طور پر اسی طرح کا اور توقیفی ہی ہے۔

سورتوں کے نام کسی ایک ہی نہج پر نہیں رکھے گئے ہیں، بلکہ مختلف سورتوں کے نام رکھنے میں مختلف انداز اختیار کئے گئے ہیں۔ متعدد سورتوں کے نام اُن کے ابتدائی لفظ ہی کو قرار دے دیا گیا ہے، مثلاً سورۂ طٰہٰ، سورۂ یٰسٓ اور سورۂ قٓ وغیرہ، بہت سی ایسی ہیں جن کے نام رکھنے کے لئے ان کے اندر کے کسی نمایاں لفظ کو لے لیا گیا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ زخرف اور سورۂ نمل وغیرہ۔ کچھ کے نام رکھنے کے لئے ایسے الفاظ منتخب کئے گئے ہیں جن سے سورہ کے کسی اہم مضمون کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مثلاً سورۂ آلِ عمران اور سورۂ نور وغیرہ۔ بعض کے نام رکھنے میں اُن کے اصل موضوعِ بحث کو سامنے رکھا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ براۃ اور سورۂ

اخلاص وغیرہ۔ نام رکھنے کے یہ مختلف طریقے، ظاہر ہے کہ عربی ذوق کے مطابق ہی اختیار کئے گئے تھے۔

سورتوں کی مقداریں باہم بڑا تفاوت ہے۔ اگر کوئی سورۃ اتنی لمبی ہے کہ پورے قرآن کے بارھویں تیرھویں حصے تک پھیلی ہوئی ہے، تو کوئی اتنی چھوٹی بھی ہے کہ اس میں دو تین مختصر جملوں اور چودہ پندرہ لفظوں سے زیادہ نہیں۔ مگر چھوٹی سورتوں کے قالب کی چھوٹائی ہرگز یہ معنی نہیں رکھتی کہ ان کا مغز اور جوہر بھی تھوڑا ہے۔ صورتِ واقعہ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ بڑی سورتوں میں تجلّیاتِ حق کی جو کرنیں ایک وسیع دائرے تک پھیلی ہوئی ہیں، وہی چھوٹی سورتوں میں ایک چھوٹے سے حلقے کے اندر سمٹ گئی ہیں۔ دراصل ان سورتوں کی حیثیت 'جوامع الکلم' کی سی ہے، اور متعدد دینی مصلحتوں کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن حکیم کے اندر ایک تعداد چھوٹی سورتوں کی بھی ہو۔

سب سے اہم مصلحت تو دین کی اصولی تعلیمات اور اس کے بنیادی افکار کو ذہنوں میں ہمیشہ مستحضر رکھنے کی تھی جو ظاہر ہے کہ بہت ہی بڑی دینی ضرورت تھی بلا شبہ لمبی سورتوں میں نہ صرف یہ کہ یہ تعلیمات موجود ہیں بلکہ پوری وضاحت اور ضروری استدلال کے ساتھ موجود ہیں، اس لئے انہیں یاد رکھنے والا ان تعلیمات اور افکار کو اپنے ذہن میں برابر تازہ رکھ سکتا ہے، لیکن عملی اور واقعاتی حیثیت سے دیکھئے تو ایسے لوگ چند فی صد سے زیادہ ہرگز نہ مل سکیں گے جو لمبی سورتوں کے یاد کر لینے اور پھر انہیں برابر یاد رکھنے والے ہوں، اس لئے عام مسلمانوں کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ چھوٹی چھوٹی سورتیں بھی نازل کر دی جائیں، جن میں دین کی بنیادی ہدایتوں کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہو۔ تاکہ اسلامی معاشرے کا کوئی ایک فرد بھی انہیں یاد کر لینے اور (کم از کم نمازوں میں تو لازمًا) بار بار دہراتے رہنے، اور اسطرح دین کی ان بنیادی باتوں کو اپنے ذہن میں پیہم تازہ کرتے رہنے کی سعادت سے محروم نہ رہ سکے پھر اگر غور کیجئے تو وہ چند فی صد لوگ بھی، جو لمبی سورتوں کے یاد رکھنے والے ہوتے ہیں، اس ضرورت سے بے نیاز نہ ملیں گے کیونکہ انسانی ذہن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر تفصیلات کو وہ اپنے لئے تشفی کا باعث پاتا ہے تو ساتھ ہی ان کی دور دراز وسعتوں میں اکثر کھو بھی جاتا ہے،

اور معانی و مطالب کے پورے سلسلے کو اپنی گرفت میں نہیں لے پاتا، بلکہ اس کے لئے اس بات کا ضرورت مند ہوتا ہے کہ یہ مطالب کچھ مختصر لفظوں میں بھی ادا کر کے اسے محفوظ کرا دیئے جائیں۔ غرض عوام و خواص، سبھی کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ دین کی اصولی تعلیمات چند جملوں میں اور چھوٹی چھوٹی سورتوں کی شکل میں بھی بیان کر دی جائیں تاکہ وہ ذہنوں پر نقش ہو رہیں، زبانیں ان کے ذکر سے خود بخود حرکت میں آجایا کریں، اور وہ اسلامی معاشرے میں ان ضرب المثلوں کی جگہ لے لیں جو عام طور سے زبانوں پر چڑھی ہوئی اور مسلمہ رہنما حقیقتوں کی ترجمان ہوا کرتی ہیں ــــ واضح طور پر یہ دین و پیروانِ دین کی ایک ایسی ضرورت تھی جو وقتی نہ تھی، بلکہ ابدی تھی۔

دوسری خاص مصلحت ابتدائے بعثت میں دعوتِ قرآنی کی طرف لوگوں کو متوجہ کرا سکنے کی تھی، کیونکہ جس وقت قرآن نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تھا، اس وقت اس کے سننے کے لئے قدرتی طور پر لوگوں کے اندر کوئی آمادگی نہ تھی۔ اس صورتِ حال کا کھلا ہوا تقاضا یہ تھا کہ ان دنوں جو باتیں فرمائی جائیں وہ ایک طرف تو بہترین پیرایۂ بیان اور جھنجھوڑ دینے والے انداز میں ہوتیں، دوسری طرف اصولی اور مختصر بھی ہوتیں، تاکہ غفلت اور نفرت کے مارے ہوئے دلوں تک بھی ان کے الفاظ جا پہنچیں، پھر جوں جوں یہ بے توجہی اور نا آمادگی کم ہوتی جائے اور لوگ بات سننے کے لیے تیار ہوتے جائیں، خواہ یہ تیاری کسی بنا پر ہو، دعوتی خطاب میں وسعت پیدا کی جاتی رہے، اور جب وہ گھڑی آجائے کہ بے توجہی اور نا آمادگی، شوق اور انابت میں تبدیل ہو چکی ہو تو دین کی تفصیلات سُنائی جائیں اور وحیِ الٰہی کا نزول پیہم ہونے لگے ــــ چنانچہ قرآن مجید کی چھوٹی، متوسط اور بڑی سورتیں بالعموم حالات کے انہی تقاضوں کے تحت نازل ہوئی ہیں، اور چھوٹی سورتیں اکثر و بیشتر اسی دَور کی نازل شدہ ہیں جب دعوتِ قرآنی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور دلوں کے دروازے ابھی اس کے لئے کھُلے نہیں تھے۔

آیت سورہ کے خاص خاص مقدار کے ٹکڑوں کو، جن کی حد بندی براہ راست اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوئی ہے، "آیت" فرمایا گیا ہے۔ سورتوں کی طرح آیتوں کی مقدار میں بھی کافی تفاوت ہے، بعض آیتیں اگر ایک دو لفظوں پر مشتمل ہیں تو بعض آٹھ دس پر، اور بعض پندرہ بیس پر،

اور بعض اُن سے بھی زیادہ لفظوں پر۔ پھر ضروری نہیں کہ ہر آیت ایک پورا جملہ ہو۔ بلکہ اکثر آیتیں اگر اسی قسم کی ہیں تو بہت سی ایسی بھی ہیں کہ جملہ ان میں سے کئی ایک کے ملنے سے مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس کتنی ہی آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک سے زائد جملوں پر مشتمل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آیتوں کی مقدار مقرر کرنے میں جملوں کی تکمیل کے اصول کو نہیں بلکہ قافیے کے اہتمام کو مقدم رکھا گیا ہے۔ جس کی دو اہم مصلحتیں تھیں:۔ ایک تو یہ کہ عبارت کا مقفیٰ ہونا عربی ادب کے محاسن میں شامل تھا، اور اہلِ عرب اس کے بڑے دلدادہ تھے۔ دوسری یہ کہ قرآنِ کریم کے حفظ کر سکنے میں یہ چیز بڑی مددگار تھی۔ اشعار ہی کی طرح مقفّٰی عبارتوں کو بھی انسانی یادداشت جس آسانی سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اس کا تجربہ ہر پڑھے لکھے شخص کو ہوگا۔ اسلئے قرآن مجید کا، اس کی حفاظت کے لئے بھی اور اس کے پیروؤں کی عملی ضرورت کے لحاظ سے بھی، جس طرح ہمہ گیر پیمانے پر یاد کر لیا جانا ضروری تھا، اس کا قطعی تقاضا تھا کہ اس کی عبارتیں مقفّٰی ہوں۔

'آیت' کے لفظی معنی نشانی اور علامت کے ہیں۔ یعنی وہ ظاہر شے، جو کسی چھپی ہوئی حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہی ہو، عربی لغت میں 'آیت' کہلاتی ہے۔ لفظ 'آیت' کے اس بنیادی مفہوم کو اگر سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو قرآن کی آیتوں کو 'آیت' فرمائے جانے کی وجوہ بہت کچھ سمجھ میں آجائیں گی۔ مثلاً:۔

قرآن[۱] کی آیتیں ایک اعجازی کلام کے اجزاء ہونے کی حیثیت سے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی 'نشانی' اور دلیل ہیں، اس لئے انہیں 'آیت' کے لفظ سے موسوم کیا گیا۔

قرآن[۲] کی آیتیں بجائے خود 'رہنمائی' ہیں، کیونکہ ان سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اور اس کے احکام و ہدایات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے بھی اُنہیں 'آیت' کہا گیا۔

قرآنی[۳] تعلیمات کی بنیاد تحکم اور اعتقادی جبر پر نہیں، بلکہ فکر و استدلال پر قائم ہے، اور اس کے فرمودات مدلل مباحث کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گویا قرآن صرف احکام و ہدایات ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اثبات و استدلال کا بھی نام ہے۔ اس لئے بھی اس کے اجزاء کو آیت فرمایا گیا (تاکہ اس کی یہ صفت آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔)

آیاتِ قرآنیہ کی، اپنے زمانۂ نزول کے اعتبار سے، دو قسمیں ہیں:۔ مکّی اور مدنی۔ مکّی وہ

آیتیں کہی جاتی ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھیں، خواہ ان کا نزول مکے میں ہوا ہو، یا کسی اور مقام پر۔ مدنی ان آیتوں کو کہا جاتا ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی تھیں، چاہے یہ نزول مدینے میں ہوا ہو، چاہے مدینے سے باہر کسی اور جگہ۔

پارے اور رکوع

پورے قرآن کو برابر کے تیس حصّوں میں، اور پھر ہر حصّہ مزید چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ پہلی قسم کے حصّوں کو 'اجزاء' یا 'پارے' اور دوسری قسم کے حصّوں کو 'رکوع' کہتے ہیں۔ یہ تقسیمیں توقیفی نہیں ہیں۔ ان کا توقیفی ہونا تو درکنار، دورِ نبوت میں، حتّٰی کہ خلافتِ راشدہ کے زمانوں میں بھی، ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ بلکہ یہ بعد کی چیزیں ہیں۔ چنانچہ پاروں کی تقسیم حجاج بن یوسف کی امارت ۷۳ھ تا ۹۵ھ میں ہوئی، اور رکوعوں کی تقسیم اور بھی آگے چل کر کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تقسیموں کو کوئی خاص اور قطعی شرعی اہمیت حاصل نہیں۔ چنانچہ قرآن شریف کے نسخوں میں فلاں جزو' (پارے) یا فلاں رُکوع' کا لفظ متن کے درمیان نہیں لکھا جاتا، بلکہ حاشیے میں درج کیا جاتا ہے، تاکہ کسی کو اُن کے توقیفی ہونے کی غلط فہمی نہ ہو سکے۔

وہ دینی مصلحتیں، جن کی خاطر یہ تقسیمیں عمل میں لائی گئی تھیں، یہ ہیں کہ ان سے عام لوگوں کو قرآن مجید کے پڑھنے اور حفظ کرنے میں بعض آسانیاں حاصل ہوں گی اور بعض رہنمائیاں ملیں گی، جیسا کہ آگے تفصیل سے واضح ہو گا۔

پاروں کی تقسیم مہینے کے دنوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، اس کے پیچھے بنیادی طور پر اس ضرورت کا احساس کام کر رہا تھا کہ ایک مومن کے لئے اپنے دین سے اپنے تعلق کو زندہ اور بیدار رکھنا ہر آن ضروری ہے، اور اس کی سب سے اہم اور مقدم تدبیر، واضح طور پر، یہ ہے کہ وہ پورے قرآن کی تلاوت کیا کرے۔ اب سوال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ اس تلاوت کے بارے میں عام لوگوں کا معمول کیا ہو؟ اور وہ کس مقدار میں قرآن پڑھا کریں؟ جن خدّامِ دین نے پاروں کی تقسیم کی ہے، اُن کے ذہن میں اس کا جواب یہ آیا کہ پورے قرآن کی تلاوت کے لئے ایک ماہ کی مدّت ایک معتدل اور مناسب مدّت ہوگی، اور عام طور سے لوگوں کو روزانہ

اس کا تیسواں حصّہ پڑھتے رہنا چاہیئے۔ اس خیال کے تحت انہوں نے قرآن کو تیس برابر کے حصّوں میں تقسیم بھی کر دیا، تاکہ لوگ، اپنی روزانہ تلاوت کے لیئے اس کی مقدار کا تعین کرنے کی زحمت سے بچ سکیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالباً ان احادیث سے رہنمائی حاصل کی، جن میں پورے قرآن کو ایک ماہ میں پڑھنے کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً صحیح بخاری کی وہ حدیث، جو پچھلے صفحات میں درج کی جا چکی ہے اور جس میں یہ مذکور ہے کہ "حضرت جبرئیلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پورے رمضان ہر رات آکر ملا کرتے تھے اور اس ملاقات میں آپؐ انھیں قرآن سنایا کرتے تھے۔" اس حدیث سے بجا طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قرآن شریف کو پورے ایک ماہ میں ختم کرنا معقول اور پسندیدہ بات ہوگی۔ اسی طرح بخاری ہی کی وہ حدیث، جس میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ صریح ہدایت پائی جاتی ہے کہ " اِقْرَأِ الْقُرْاٰنَ فِیْ شَهْرٍ " (قرآن پورے ایک مہینے میں پڑھا کرو)، اس ارشادِ نبویؐ سے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے تلاوتِ قرآن کا یہی طریقہ رسولِؐ خدا کا پسند فرمایا ہوا طریقہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اگرچہ اپنے غیر معمولی شغف کی بناء پر، اور اپنی قوّتِ تلاوت کا ذکر کر کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پورا قرآن ایک ہفتہ کے اندر ہی پڑھ لینے کی اجازت حاصل کر لی تھی، مگر ظاہر بات ہے کہ یہ ایک مخصوص اجازت تھی، جو اُن کے بار بار کے اصرار پر انہیں دی گئی تھی، ورنہ شروع میں ان سے یہی فرمایا گیا تھا کہ قرآن ایک مہینے میں پڑھا کرو۔

ان احادیث کی روشنی میں یہ خیال منشاءِ رسولؐ کے ٹھیک مطابق ہی تھا کہ لوگوں کو قرآن کی تلاوت معمولاً تیس دنوں میں پوری کرنے کا مشورہ دیا جائے۔

اس بات کے سامنے آجانے کے بعد پورے قرآن کو برابر کے تیس حصّوں (پاروں) میں تقسیم کر دینے کا اقدام دراصل اسی منشائے رسولؐ کی ایک گونہ تکمیل تھا۔

اس سلسلے میں اس وضاحت کی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ یہ تقسیم خالص مقداری تقسیم ہے، اور اس میں کسی معنویت یا ربط و مناسبت کی تلاش بالکل بے سود ہی نہیں بلکہ بلا وجہ بھی ہوگی۔ چنانچہ اس تقسیم میں آپ کو بعض مقامات پر ایسا بھی نظر آئے گا کہ پارہ تو ختم ہو گیا ہے مگر پہلے سے چلنے والی بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور اس کے بقیہ حصّے سے اگلے پارے کا

آغاز ہو جاتا ہے۔

رکوعوں کی تعیین و تقسیم کے پیچھے بھی کچھ اسی طرح کی مصلحت کارفرما تھی جیسی کہ پاروں کی تقسیم کے پسِ پشت تھی۔ یعنی یہ کہ آیتوں کے درمیان ایسے مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں سلسلۂ قرآت ختم کرنے میں کوئی بے ڈھنگاپن اور نقص لازم نہ آتا ہو۔ اور اس نشاندہی کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ مطالبِ قرآن سے ناواقف لوگ از خود یہ تعین نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ جس کسی کو آیتوں کے معنی ہی نہ معلوم ہوں وہ یہ کیسے جان سکتا ہے کہ قرآت کا سلسلہ کس جگہ ختم کرنا مناسب ہو گا اور کس جگہ نامناسب؟ وہ تو لازماً ایسے مقام پر بھی اپنی زبان کو روک دے سکتا ہے جہاں بات بالکل ہی ادھوری رہ جاتی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی بھونڈی اور ناپسندیدہ حرکت ہو گی۔ اب مجبوری اور نادانستگی کے اس بھونڈے پن سے لوگوں کو بچانے کی ایک ہی شکل تھی، اور وہ یہی کہ قرآن مجید میں ایسے مقامات کی تعیین کر دی جائے جہاں اگر قرآت ختم کی جائے تو کوئی اس طرح کی خرابی واقع نہ ہو سکے۔

لیکن اس تعیینِ رکوع کے سلسلے میں ایک اور بات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، اور وہ یہ کہ یہ تعیین ہر اس جگہ نہیں کر دی گئی ہے جہاں قراءت کا سلسلہ صحیح طور سے ختم کیا جا سکتا ہو، بلکہ اسی کے ساتھ آیتوں کی ایک مناسب تعداد کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ پارہ عموماً پندرہ بیس رکوعوں میں منقسم ہے، اور ایک رکوع میں اوسط مقدار کی آٹھ دس آیتیں رکھی گئی ہیں۔ چھوٹی آیتوں کی تعداد، حسبِ مقدار زیادہ اور بڑی آیتوں کی کم ہے۔ مذکورہ 'تعیین، اور نشاندہی' کے سلسلے میں آیتوں کی ایک مناسب تعداد کا یہ لحاظ در اصل نماز کے پیشِ نظر رکھا گیا ہے' جس میں ہر شخص کو قرآن کی کچھ نہ کچھ قرآت ضرور ہی کرنی پڑتی ہے۔ گویا رکوعوں کی تعیین میں یہ بات بھی مدِ نظر رکھی گئی ہے کہ یہ تعیین اتنے حصۂ قرآن کے بعد ہو جتنا کہ ایک رکعت میں عموماً پڑھا جاتا ہے، یا جسے عموماً پڑھا جانا چاہیئے اور غالباً اسی وجہ سے آیتوں کے اِن مجموعوں کا نام 'رکوع'، رکھا گیا ہے۔ کیونکہ نماز میں رکوع، قیام اور قرآتِ قرآن کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نام اس امر کی طرف اشارہ کرنے والا ہے کہ اگر چاہو تو قرآنِ کریم کا اتنا حصّہ پڑھ لینے کے بعد قیام کو ختم کر کے رکوع میں چلے جاؤ۔

اہم اصطلاحات

ہر مذہبی کتاب کی طرح قرآنِ حکیم کی بھی ایک مخصوص زبان اور کچھ مخصوص اصطلاحات ہیں، جو اس کی دعوت اور اس کی تعلیمات کے سمجھنے کے معاملہ میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں، کوئی شخص قرآن سے ذرا بھی واقف نہیں ہو سکتا اگر وہ پہلے اس کی اصطلاحوں کے مفہوم سے واقفیت بہم نہ پہنچا چکا ہو۔ اس لئے قرآن مجید کا تعارف بھی اس بات پر موقوف ہے کہ کم از کم اس کی اہم اور نمایاں اصطلاحوں کی ضروری حد تک وضاحت سامنے آجائے۔

اللہ

قرآن مجید کی سب سے اہم اور سب سے بنیادی اصطلاح "اللہ" کا لفظ ہے، اسلئے سب سے پہلے اسی کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔

لفظ "اللہ" اصل میں "اَلْاِلٰہ" تھا، جو کثرتِ استعمال سے ہلکی سی تبدیلی کے بعد "اللہ" ہوگیا۔ "الالٰہ" میں اصل لفظ صرف "الٰہ" ہے، اور اس سے پہلے جو "ال" کا جزو ہے وہ عربی زبان کا نشانِ تعریف ہے، جو اسمِ نکرہ کو معرفہ بنانے کے لئے شروع میں بڑھا دیا جاتا ہے۔ جس طرح کہ انگریزی میں 'The' (دی) جس اسم سے پہلے لگا دیا جاتا ہے وہ نکرہ سے معرفہ بن جاتا ہے، اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی اسم عام نہیں رہ جاتا کہ اس سے کوئی سی ذات بھی مراد لے سکیں، بلکہ اس کی وجہ سے اس میں ایک تعین کی شان پیدا ہو جاتی ہے، اور اب اس سے کوئی مخصوص و متعین ذات ہی مراد لی جا سکتی ہے ـــــ اس لئے "اَلْاِلٰہ" کے معنی ہوئے "وہ مخصوص و متعین الٰہ"۔ "الٰہ" کے معنی معبود کے ہیں۔ یہ لفظ "الف، لام، ھا" کے سہ حرفی ادے سے

بنا ہے، جس سے نکلے اور بنے ہوئے مختلف مصدروں کے معانی یہ ہیں:۔ (۱) متحیر ہو جانا (۲) کسی کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے سکون و اطمینان پانا (۳) کسی کی طرف فرطِ اشتیاق سے لپکنا (۴) پوشیدہ ہونا (۵) بلند ہونا (۶) پرستش کرنا ـــــ ان مختلف معانی میں کوئی بیگانگی اور ناہم آہنگی نہیں ہے، بلکہ گہرا فطری ربط ہے، جو غور و فکر کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ 'الٰہ' کے لفظ کو اہلِ عرب نے جب 'معبود' کے لئے اِستعمال کیا تو اس میں ان سب معنوں کی نمائندگی تھی۔

یعنی ان کے یہاں 'الٰہ' اس ہستی کو کہا جاتا تھا جو فوق البشری صفات رکھتی ہو، جس کی حقیقت اور عظمت کا علم حاصل کرنے سے انسانی عقل عاجز رہ جاتی ہو، جس کی ذات و صفات میں غور و فکر کا نتیجہ حیرت زدگی کے سوا اور کچھ نہ ہو، جو دوسروں کا ملجا و ماویٰ ہو، محبوب و مطلوب ہو، حاجت روا ہو، صاحبِ اقتدار ہو، ذی شان ہو، جس تک ظاہری حواس کی پہنچ ممکن ہی نہ ہو، اور ان ساری صفتوں سے متصف ہونے کے باعث اس قابل ہو کہ اس کی پرستش کی جائے، اس کے غضب سے ڈرا جائے۔" لیکن یہ کامل الٰہ کا مفہوم تھا، اور چونکہ ان کے یہاں 'الٰہ' و معبود ایک دو نہ تھے بلکہ بے شمار تھے، اور ایک سے زائد معبودوں کو تسلیم کرنے کی شکل میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ سبھی کو ان ساری صفتوں کا جامع خیال کرتے، اس لئے اس لفظ (الٰہ) کو جب وہ بولتے تو ہر موقع پر اس کا بعینہٖ ایک ہی مفہوم نہیں ہوتا تھا، بلکہ اگر وہ اس کا اطلاق ایسی ہستی پر کرتے تھے جو مذکورہ بالا تمام صفتوں کی جامع ہوتی تو ساتھ ہی ایسی ہستیوں پر بھی کرتے جو ان کے خیال کے مطابق صرف چند ہی صفتوں کی حامل ہوتیں۔ اس طرح حقیقتِ واقعہ یہ معلوم ہوئی کہ اہلِ عرب کے نزدیک 'الٰہ' کے معنی ہر ایسی ہستی کے تھے جس میں مذکورہ بالا صفات میں سے کچھ، یا سب موجود پائی جاتی ہوں، اور اس بنا پر وہ پرستش کی مستحق بھی ہو، اگر وہ ان تمام صفتوں کی جامع ہو تو کامل الٰہ ہے، ورنہ فی الجملہ اور نسبتاً کم درجہ کی الٰہ۔

لفظِ 'الٰہ' کے اس مفہوم کو اگر سامنے رکھئے تو 'اللہ' (یعنی اُلْاِلٰہ) کے معنی بظاہر کسی ایسی خاص اور متعین ہستی کے ہوں گے جس میں مذکورہ بالا ساری صفات یا ان کا کوئی جز و موجود ہو، لیکن حقیقتِ واقعہ یہ نہیں ہے، عربوں کے یہاں 'اللہ' کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں تھا، بلکہ اس سے بہت بلند تھا۔ وہ 'اللہ' اس ذاتِ خاص کو کہتے تھے جس کے بارے میں ان کا اعتقاد یہ تھا

تھا کہ وہ اِن تمام صفات کی جامع ہے اور ان کے سوا بقیہ دوسری ساری صفاتِ کمال، مثلاً خالقیت، ربوبیت رزاقیت اور حاکمیت وغیرہ کی بھی مالک ہے، جب کہ اپنے دوسرے معبودوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس میں یہ ساری صفات موجود ہوں یا جس میں پائی جانے والی کوئی صفت بھی ٹھیک اسی نوعیت اور مرتبے کی ہو جو نوعیت اور مرتبہ کہ اللہ کے اندر پائی جانے والی اس صفت کا ہے۔ 'اللہ' اور دوسرے معبودوں کے بارے میں ان کے ان عقائد و خیالات کا مفصل ثبوت قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ اور قدیم عربی لٹریچر میں بھی۔

یہاں پہنچ کر یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ عربوں کے یہاں بے شمار الٰہوں میں سے صرف اسی ایک خاص الٰہ کو 'اللہ' (الاِلٰہ) کیوں کہا جانے لگا؟ ایسا کیوں ہوا کہ یہ لفظ، جو دراصل صفت تھا اور اُن کے ہر معبود، کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا، صرف اسی ایک ذات کے لئے مخصوص ہو گیا، اور اس کا نام قرار پا گیا؟ جب اُن کا اعتقاد یہ تھا کہ صرف ایک ہی ہستی ہے جو ساری صفاتِ کمال کی جامع ہے اور دوسرے تمام معبودوں میں سے کوئی بھی معبودیت کی یہ شانِ کامل نہیں رکھتا تو بالکل قدرتی بات تھی کہ ان کی نظر میں وہ ہستی لفظ 'الٰہ' کے استعمال کی اولین مستحق قرار پاتی، اس لفظ کو سن کر ان کا ذہن سب سے پہلے اسی کی طرف منتقل ہوتا بلکہ فی الواقع اصل الٰہ اور معبود وہ اسی کو سمجھتے، اور پھر اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا کہ انہوں نے جہاں اپنے دوسرے معبودوں کے الگ الگ مستقل نام رکھے تھے، جن سے وہ جانے پہچانے اور یاد کئے جاتے تھے، وہاں اس معبودِ خاص کا وہ الگ سے کوئی نام نہ رکھتے، بلکہ اسی لفظ 'الٰہ' کو جو اصلاً صفت تھا، نشانِ تعریف 'اَل' کے ساتھ اس کا نام اور علم قرار دیدیتے۔ تاکہ اس طرح اس کی معبودیت کی مخصوص، منفرد اور بالاتر حیثیت کا اظہار ہو جائے، یہ واضح ہو رہے کہ 'الٰہ' و معبود ہونے کا سب سے زیادہ بلکہ حقیقی استحقاق اسی ہستی کو حاصل ہے، جس طرح کہ کسی بے نظیر کتاب کا نام 'الکتاب'، اور کسی بے مثال معلم کا نام 'المعلم'، رکھ دیا جاتے، چنانچہ عرب میں نام رکھنے کا یہ ایک معروف طریقہ تھا اور اسی کے مطابق انہوں نے اپنے اس معبودِ خاص اور الٰہِ کامل کا نام 'الاِلٰہ' رکھ لیا — اور پھر اپنے لسانی قواعد کے تحت اس میں سے 'الٰہ' کا 'الف' حذف کر دیا کیونکہ ایسے لفظ کو ان کا لسانی ذوق ہلکے سے ہلکا اور زبان سے بآسانی ادا ہو جانے والا رکھنا چاہتا تھا جو کثرت سے استعمال ہو۔

اور جس کا ذکر زبانوں پر بار بار آئے۔ اس طرح یہ 'اُلْاِلٰہ' اللہ ہو گیا۔

یہ تھے عربوں کے یہاں 'الٰہ' اور 'اللہ' کی اصطلاحوں کے مفہوم۔ جب قرآن نازل ہوا تو چونکہ اس کے مخاطب اول یہی عرب تھے، جس کے باعث اس کی زبان بھی عربی رہی اور اسے جو بات بھی کہنی تھی اسی زبان کے الفاظ اور محاوروں میں کہنی تھی اس لئے اس نے کائنات کے خالق و پروردگار کو بھی قدرتًا اسی نام 'اللہ' سے پکارا، جو اہلِ عرب کے یہاں رائج تھا۔ اسی طرح 'الٰہ' کی اصطلاح بھی اس نے استعمال کی، مگر ان دونوں اصطلاحوں کو اس نے ٹھیک اُن ہی معانی اور تصوّرات کے ساتھ نہیں لیا جو عربوں کے ذہن میں تھے، بلکہ بعض اہم اصلاحوں اور بنیادی ترمیموں کے ساتھ لیا:۔ سب سے اہم اصلاح اور بنیادی ترمیم تو اس نے یہ کی کہ الوہیت و معبودیت کی ساری صفتوں کو صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ٹھیرا دیا، اس نے کہا کہ کسی دوسری ہستی میں، خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، معبودیت کی کوئی ایک صفت بھی موجود نہیں، اس لئے خواہ 'الٰہ' کہو، خواہ 'اُلْاِلٰہ'، اور 'اللہ'، اس سے مراد فی الواقع وہی ایک ذات ہوگی، اسی ایک ہستی کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں، اور کئے جانے چاہئیں۔ دوسری کوئی ہستی ان لفظوں سے پکارے جانے کی سزاوار ہی نہیں بلاشبہ اس نے اپنے کلام میں جا بجا 'الٰہ' کا لفظ ان معنوں میں بھی استعمال کیا ہے جو اہلِ عرب کے ذہنوں میں تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ان کے عقیدے کی نقل و روایت کے طور پر ہے، نہ کہ خود اپنے عقیدے کے اظہار کے طور پر۔ دوسری بڑی اصلاح اس نے یہ کی کہ اس اسمِ ذات "اللہ" کے ساتھ اہلِ عرب جن صفات کو وابستہ کرتے تھے اگرچہ وہ اُن کی نگاہ میں حدِ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں، مگر اس نے انہیں ناقص قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری عقلِ نارسا نے معبودیت کا جو سب سے اونچا مقام سمجھ رکھا ہے وہ درحقیقت اپنے اندر بہت کچھ پستیاں بھی رکھتا ہے، اور کمالِ صفات کے بارے میں تمہارا تصوّر غلط اور ادھورا ہے۔ "اللہ" کی صفات اس طرح کی ہیں، اور اس کا مقام یہ ہے۔

'اللہ' کی ہستی کو قرآن نے جن صفات سے متّصف قرار دیا ہے وہ تعداد میں بہت ہیں، مختصرًا یہ سمجھئے کہ کوئی اچھی صفت نہیں جو ان میں موجود نہ ہو۔ ان میں سے نمایاں صفتیں یہ ہیں:۔

(۱) وہ، اور صرف وہی، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ (اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ

اَلْقَیُّوْمُ، (بقرہ)، کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ، (قصص) (۲)، وہ جسم نہیں رکھتا، اور جسمانیت سے یکسر پاک و برتر ہے۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ (انعام)، لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ، (شوریٰ) (۳)، وہ دکبھی کوئی جسمانی شکل بھی اختیار نہیں کرتا، نہ تو کسی چیز میں حلول کرتا ہے نہ کسی چیز سے متحد ہوتا ہے (لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ط (مائدہ) (۴)، ہر چیز کا خالق ہے اور پوری کائناتِ ہستی اس کی مخلوق ہے۔ (خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ، (انعام)، (۵)، وہ نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا (لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ، (اخلاص) (۶) ساری کائنات کا اقتدارِ حکومت براہِ راست اسی کے ہاتھ میں ہے (بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ، (یٰس)، (۷) آسمان سے لیکر زمین تک پورے عالمِ وجود کا نظم و نسق وہی انجام دلاتا ہے (یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (سجدہ) (۸)، سب کا رازق اور پروردگار ہے (رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا۔ (صافات) (۹)، زندگی اور موت دونوں کا خالق ہے) خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ، (ملک) وہی زندگی عطا کرتا اور موت دیتا ہے (اِنَّہٗ ھُوَ اَمَاتَ وَاَحْیَا (النجم) (۱۰) سب کی امان اور پناہ ہے، اَلْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ، (حشر) ڈھکا اور چھپا، گذرا ہوا اور واقع ہونے والا، سب کچھ جانتا ہے (ھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (بقرہ)، عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ، حشر) (۱۲) سب کچھ سنتا ہے (وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، (انعام) (۱۳) ہر بات پر قادر ہے) اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (بقرہ) (۱۴)، سب پر غالب ہے اور کوئی اس کے فیصلے کو یا حکم کو چیلنج نہیں کرسکتا (اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ، (حشر) (۱۵) حکیم ہے، اس کا کوئی کام حکمت اور مقصدیت سے خالی نہیں ہوتا (وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ، (سبا) (۱۶) بڑا رحیم ہے (اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، (الفاتحہ) محبّت و رافت اس کا شیوہ ہے، وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (بقرہ) اس کی رحمت اور مہربانی ذرّے ذرّے پر چھائی ہوئی ہے وَسِعَتْ رَحْمَتِیْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف)، (۱۷) عادل ہے، لوگوں کے ساتھ پورے انصاف کا برتاؤ کرتا ہے (لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (یونس)، کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا (وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ، (قٓ)، اس کے ارشادات واحکام سب کے سب پوری طرح عادلانہ ہوتے ہیں) وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا، (انعام) (۱۸) نافرمانوں اور سرکشوں سے انتقام لینے

والا ہے) وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ، (آلِ عمران) (۱۹) معافی چاہنے والوں کو معاف کر دیا کرتا ہے، وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ، (بروج) اور بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا، (نصر) (۲۰) نیکیوں کا بڑا قدر دان ہے (وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ، (تغابن) (۲۱) اس کا ارادہ پورا ہو کر رہتا ہے (فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ، (بروج) (۲۲) متکلم ہے، اور گفتگو فرماتا ہے (وَمِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (بقرہ) (۲۳) جو چاہتا ہے کرتا ہے (لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (آلِ عمران) اور جو کچھ چاہتا ہے صرف وہی وجود میں آسکتا ہے، حتیٰ کہ اس کی مشیّت کے بغیر کوئی از خود کچھ چاہ بھی نہیں سکتا (وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ (دہر) (۲۴) غنی ہے ہر بات سے بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی حاجت نہیں (وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ (فاطر) (۲۵) بالذات حمید اور ستودہ صفات ہے (اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (ہود) (۲۶) ہر نقص سے پاک اور ہر کمال سے متّصف ہے، اس کے اندر کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو مقامِ الوہیت کے شایانِ شان نہ ہو (اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ (حشر) (۲۷) وہ ہر حیثیت سے بے مثل ہے، اسے کسی چیز سے بھی تشبیہہ نہیں دی جاسکتی، (ليس كمثله شيءٌ۔ (شوریٰ) زمین و آسمان کی کسی شے پر بھی اسے قیاس نہیں کیا جاسکتا، (وله المثل الاعلیٰ فی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (روم) (۲۸) معبود صرف وہی ہے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ بقرہ) پوری کائنات میں صرف اسی کا دور دورہ ہے۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ والارض (جاثیہ) اور اس کے سوا کوئی بھی نہیں جس کے اندر اس معبودیت اور کبریائی کا کوئی شمّہ بھی پایا جاتا ہو، سب کے سب یکسر بے بس اور محکوم ہیں، اور اسی کے غلام اور بندے (وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ (روم) پھر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے ان غلاموں اور بندوں میں سے کسی کو شرفِ تقرّب بخش کر اپنی حاکمیت میں شریک کر لیتا ہو، وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (کہف)

اللہ کی ذات اور صفات کے بارے میں ان وضاحتوں کے بعد، اس مسئلہ سے متعلق چند باتیں اور بھی ہیں جن سے واقف ہو لینا ضروری ہے:-

(۱) پہلی بات تو یہ کہ جہاں تک "اللہ" کی ذات کا تعلق ہے، اس کی حقیقت تک انسانی فکر کی رسائی ممکن نہیں۔ اس لئے اس کو صرف اس کی صفات ہی کے ذریعہ پہچانا جاسکتا ہے، جن کے جلووں سے یہ پوری کائناتِ ہستی معمور ہے، اور یہاں جو کچھ ہے وہ سب کا سب، اس کی

کسی نہ کسی صفت ہی کا مظہر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے جو صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرما رکھی ہے کہ :-

تَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ ۔	" اللہ کی مخلوقات میں غور و فکر کرتے رہو، مگر خود اس کی ذات کے بارے میں اس کی کوشش نہ کرو۔"
(روح المعانی جزو ۲۷، ص ۶۹)	

ذاتِ الٰہی کی حقیقت کا انسانی فکر و نظر سے بالاتر ہونا ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ چنانچہ انسان کی فکری صلاحیتوں اور رسائیوں کا جس شخص کو بھی اندازہ ہوگا اس سے یہ بات مخفی نہیں ہو سکتی کہ "اللہ" کی ذات، تو بہت بڑی چیز ہے، معمولی سے معمولی مخلوقات کا حال یہ ہے کہ ان کے بارے میں ہمارا علم صرف ان کی صفات ہی تک پہنچ کر رک جاتا ہے، اور ان کی حقیقتِ ذات بڑی حد تک ہمارے لئے ایک راز ہی رہ جاتی ہے۔ پھر اس ذات کی حقیقت کو پا لینا ہمارے لئے کیسے ممکن ہے جو دیگر ساری موجودات سے بنیادی طور پر مختلف ہے، جو ہر حیثیت سے بے مثل ہے، جس کو کسی اور شے سے کوئی مشابہت ہے ہی نہیں، جو خالق ہے جبکہ اس کے سوا ہر شے مخلوق ہے، جو واجب الوجود ہے جب کہ دوسری ہر چیز ممکن اور حادث ہے، جس کی ہر صفت حدِ کمال کو پہنچی ہوئی اور ازلی و ابدی ہے جب کہ اس پورے عالمِ ہستی میں دوسرا کوئی نہیں جس کی ایک صفت بھی اس نوعیت کی ہو؟ غرض انسانی فکر و تدبر کے احاطہ میں اگر کوئی چیز آسکتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ صرف صفات کا علم ہے، اس کی ذات کی حقیقت تک پہنچنا عقلاً ایک ناممکن بات ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اپنی گفتگو صرف صفات ہی کی بحثوں تک محدود رکھی ہے۔

اس مسئلے ـــــ مسئلہ ذات و صفاتِ الٰہی ـــــ کے سلسلے میں بعض اور سوالات بھی اٹھائے جا سکتے ہیں :- مثلاً یہ کہ صفاتِ عینِ ذات ہیں، یا اس سے الگ اپنا کوئی مستقل وجود رکھتی ہیں؟ اگر الگ وجود رکھتی ہیں تو ذات کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ وہ کس طرح ذات کے اندر رہ کر پائی جاتی ہیں؟ لیکن یہ واضح طور پر خالص فلسفیانہ بحثیں ہیں، جو انسانی فطرتِ سلیم کی نہیں، بلکہ دراصل اس کی قوتِ فکر و خیال کی ناخود شناسی کی پیدا وار ہیں۔ قرآن

نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کے سوالوں کا جواب نہیں دیا ہے بلکہ ان کے ذکر کو بھی مناسب نہیں سمجھا ہے، اور اگر اس سلسلے میں اس نے کچھ کیا ہے تو صرف یہ کہ انسان کو اس کا اپنا مبلغِ علم اور حدِّ ادراک یاد دلا کر اس قسم کی کج فکریوں سے روک دیا ہے۔ چنانچہ جب کچھ لوگوں نے یہ سوال اٹھایا کہ یہ وحی کیا چیز ہے اور اس کی کیا حقیقت ہے؟ تو اُن سے کہہ دیا گیا کہ وحی کی حقیقت تمہارے دائرۂ علم و ادراک میں آنے والی چیز نہیں، تمہیں بتایا جائے تو کیا بتایا جائے، تمہاری قوتِ فکر و فہم کا حال تو یہ ہے کہ اگر اس کے روبرو وحی کی حقیقت منکشف کر دی جائے تو اس کا حاصل اتنا بھی نہ ہوگا جتنا کہ ایک بچّے کے روبرو کسی پیچدار فلسفیانہ مسئلہ پر تقریر کر دینے کا ہو سکتا ہے (سورۂ بنی اسرائیل)

اس کے علاوہ ایسے سوالات نہ چھیڑنے اور ان کے جوابات نہ دینے کی ایک وجہ اور بھی تھی، اور وہ یہ کہ اس طرح کی بحثیں اس مقصد سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی تھیں جس کے لئے قرآن نازل ہوا تھا۔ ہر کتابِ الٰہی کی طرح قرآن کے نزول کا مقصد بھی صرف ہدایت ہے، لوگوں کی اخلاقی اصلاح ہے، اُن کے نفوس کا تزکیہ ہے، اُن کو نیکی اور حق پرستی کی تلقین، اور اس ضابطۂ زندگی کی تعلیم ہے جو آقائے حقیقی کا پسندیدہ اور تسلیم شدہ ضابطہ ہے، اور جس پر چل کر انسان اپنی زندگی کا مقصد پورا کر سکتا اور اپنا انجام کامیابی کا انجام بنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے، اس مقصد کیلئے اسے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ میرا ایک خالق اور مالک ہے، اس کی یہ یہ صفتیں ہیں، اور میری ذات کی حد تک ان صفتوں کے یہ تقاضے ہیں۔ لیکن اگر وہ اتنے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ غیر ضروری تفصیلات کی ٹوہ میں پڑتا ہے، ذاتِ الٰہی کی حقیقت پا لینا چاہتا ہے، ذات و صفات کے تعلق کی کیفیت معلوم کر لینا چاہتا ہے، تو خواہ وہ اپنے اس شوقِ جستجو کو کتنا ہی معقول اور علمی کیوں نہ خیال کرے، مگر کوئی صحیفۂ ربّانی اس کی اس باب میں حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا، بلکہ اسے اپنے مقصدِ نزول کے لئے بالکل غیر ضروری اور لاحاصل قرار دے کر اس سے اسے باز رہنے کی تنبیہہ کرے گا۔

(۲) دوسری بات، جو اس اہم ترین مسئلے کے سلسلے میں یاد رکھنے کی ہے، یہ ہے کہ صفاتِ کمال کی یہ کثرت، ذات کی کثرت کا مظہر ہرگز نہیں ہے۔ (جیسا کہ بعض مذاہب کے ماننے والوں نے گمان کر رکھا ہے) بلکہ یہ صفتیں اور قوتیں، ساری کی ساری، اسی ایک ذات

اُللہ' کے اندر مرتکز ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس واضح حقیقت کو یہ فرما کر روزِ روشن کی طرح نمایاں کر دیا ہے کہ:-

اُدْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ (بنی اسرائیل)	"چاہے تم 'اللہ' کہہ کر پکارو چاہے 'رحمٰن' کہہ کر جو بھی (اچھا) نام لو گے تو (اس سے مراد اللہ ہی کی ذات ہوگی)، اسلئے کہ سارے اچھے نام اسی کے لئے ہیں۔"

یعنی تم معبودیت کی جس صفت اور قوت کو بھی سامنے رکھ کر معبود ہستی کا تصوّر کرو گے، اس سے مُراد ہمیشہ وہی ایک ہستی ہوگی جس کا نام 'اللہ' ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ مثلاً اگر تم نے رحمت وشفقت کا تصوّر ذہن میں رکھ کر 'رحمان' کہا تو اس سے مراد کوئی اور ذات ہوگی، اور اگر کچھ دوسری باتوں اور صفتوں کے پیشِ نظر 'اللہ' کہا تو اس سے کوئی اور ذات مُراد ہوگی۔

بلاشبہ صورتِ واقعہ یہی ہے کہ یہ دنیا، جو ہماری نظروں کے سامنے ہے، اس میں متضاد قسم کے واقعات وحوادث وجود میں آتے رہتے ہیں۔ یہاں رحم وکرم کی بارشیں بھی ہوتی رہتی ہیں اور قہر وجلال کے زلزلے بھی آتے رہتے ہیں، یہاں لذّتیں اور آسائشیں بھی ملتی رہتی ہیں اور مصائب کی آندھیاں بھی اٹھتی رہتی ہیں، یہاں صحت اور حیات بھی ہے اور بیماری اور موت بھی، یہاں امن وامان بھی ہے اور فتنہ وفساد بھی، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان مختلف ومتضاد واقعات کے سرچشمے بھی مختلف ہیں، اور مختلف قوتوں کی مالک مختلف ہستیاں ہیں جو انہیں ظہور میں لاتی رہتی ہیں۔ اس کے بخلاف حقیقتِ واقعی یہ ہے کہ ان سارے واقعات وحوادث کا سرچشمہ صرف ایک 'اللہ' ہے۔ یہاں جو کچھ بھی وجود میں آتا ہے اسی کے امر سے وجود میں آتا ہے۔ اور وہ ساری قوتیں جن کا یہ واقعات مظہر ہیں، اسی ایک ذات کی مختلف صفتیں ہیں، اور سب کی سب اسی کے اندر مرتکز ہیں۔ کوئی قوت اپنا الگ سے کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی، اور کوئی صفت نہیں جس کی مالک کوئی اور ذات ہو۔

(۳) تیسری بات یہ کہ یہ صفات، جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات متصف ہے، سب کی سب حسن وخوبی کی صفات ہیں اور ہر قسم کے عیوب ونقائص سے یکسر پاک ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی

بُرائی کی صفت نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے بجائے خود اس بات کو بھی، کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے نقائص اور عیوب سے پاک ہے، اس کی ایک مستقل صفت بتایا ہے:۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الخ (حشر)	وہ اللہ ایسا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں (سارے جہانوں کا) بادشاہ ہے، (ہر نقص سے پاک و برتر ہے، (ہر عیب سے) منزہ ہے۔

اور اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ:۔

فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل)	اسی کے لئے ہیں ساری اچھی صفتیں۔

اس بارے میں ان ناپسندیدہ واقعات اور تلخ حوادث کی بنا پر کوئی الجھن نہ ہونی چاہیے جو دنیا میں برابر پیش آتے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ واقعات اپنے صرف عارضی اثر کے اعتبار سے اور بالکل محدود معنوں میں ناپسندیدہ ہوتے ہیں، اپنے آخری اور حقیقی نتائج، نیز کلی مصالح کے اعتبار سے اور وسیع تر معنوں میں ناپسندیدہ ہرگز نہیں ہوتے، ٹھیک اسی طرح جس طرح مریض کے جسم پر ڈاکٹر کا نشتر چلانا یا اس کے منہ میں کڑوی دوائیں ڈالنا، چمن کے پودوں کا مالی کے ہاتھوں تراشا جانا، قاتلوں اور باغیوں کا عدالت کی طرف سے تختۂ دار پر چڑھایا جانا بظاہر ناپسندیدہ ہونے کے باوجود فی الواقع ناپسندیدہ بالکل نہیں ہوا کرتا۔ اسلئے اس دنیا میں اگر وبائیں پھوٹتی رہتی ہیں، قحط پڑا کرتے ہیں، سیلاب آیا کرتے ہیں، ظالموں، بدکاروں اور مفسدوں کو دولت اور عزّت کی بہاریں ملا کرتی ہیں اور نیکوکاروں کو مصائب کے تھپیڑے لگا کرتے ہیں۔ تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس دنیا کا خداوند (معاذ اللہ) غافل، تخریب پسند بے مروّت، ظالم، خوں آشام، عبث کار، تفریح باز اور ناقدر شناس ہے۔ کیونکہ اس طرح کے واقعات کی سطح پر جو "فساد" دکھائی دیتا ہے وہ فی الواقع اپنے پیچھے عظیم تر "صلاح" رکھتا ہے، اور ظاہر کی "تخریب" اہم تر "تعمیر" کا عنوان ہوا کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک طرف تو فساد اور تخریب کی فطرت میں چونکہ شور اور ہنگامہ ہوتا ہے اس لئے ہم اس کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اور دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے ہیں، جب کہ صلاح و تعمیر کی فطرت میں سکون اور خاموشی ہوتی ہے اور اس کی طرف نگاہیں مشکل ہی سے اُٹھ پاتی ہیں۔ ایک مکان جس وقت تعمیر ہو رہا ہوتا ہے اسوقت

کوئی آواز نہیں سناتی دیتی، لیکن جس وقت وہ گرتا ہے تو بستی کی بستی اس کے دھماکے سے چونک پڑتی ہے۔ دوسری طرف خود انسان کی بھی فطرت کا حال یہ ہے کہ وہ پسندیدہ باتوں کے مقابلے میں ناگوار باتوں کا اور مسرّت کے مقابلے میں رنج کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے۔ دس باتیں اگر اسے خوشی کا سامان مہیا کرنے والی ہوں اور صرف ایک بات غم کی وجود میں آجائے، تو یہی ایک بات اس کے ذہن پر چھا جائے گی، اور وہ ان دس باتوں کو گویا بھول سا جائے گا۔ ان دونوں حقیقتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کم نظر انسان واقعاتِ عالم کی صحیح نوعیت سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ ظاہر کے فساد و اختلال کو تو وہ دیکھ لیتا ہے مگر تہ کی تعمیری مصلحتوں اور اعلیٰ حکمتوں تک اس کی نظر نہیں پہنچ پاتی۔ ورنہ ان واقعات میں سے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جس کا مآل اصلاح و تعمیر نہ ہو۔ اسلئے اللہ تعالیٰ کی وہ صفت بھی جو اس واقعے کا سبب بنی ہوتی ہے، لازمی طور پر حُسن و خوبی ہی کی صفت ہوتی ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ ان گوناگوں صفات میں عمل و اثر کی کامل ہم آہنگی ہے۔ ان میں سے کوئی صفت بھی اس طرح کام نہیں کرتی کہ اس کے نتیجے میں کسی دوسری صفت کے تقاضوں کی نفی ہو جائے۔ اس کے بخلاف ہر صفت کے اپنے حدودِ عمل ہیں، وہ ایک خاص حد، حدِ اعتدال تک جاتی ہے، اور غلو و افراط کے نشان نظر آتے ہی اپنے قدم روک لیتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ کی ایک صفت 'رحمت' ہے، لیکن اس کے رحمٰن و رحیم ہونے کے معنی یہ کسی طرح نہیں کہ نیک و بد سبھی اس کی مغفرت سے بہرہ ور ہو جائیں گے، اور وہ اپنے نافرمانوں کو بھی سزا نہ دے گا۔ کیونکہ پھر وہ عادل، حکیم اور شکور (قدر شناس)، کچھ نہ کہا جا سکے گا۔ اسی طرح اس کی ایک صفت مطلق المشیئۃ، ہونے کی ہے، یعنی یہ کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے صرف وہی وجود میں آتا ہے۔ لیکن قطعاً اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کا اپنا ارادہ و عمل کچھ نہیں، اللہ ہی جسے چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے، کسی وجہ اور استحقاق کے بغیر ہدایت دیدیتا اور نیکو کار بنا دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے گمراہی اور بدکرداری کے غار میں دھکیل دیتا ہے، اسی طرح جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا جہنم میں ڈال دے گا، قطع نظر اس سے کہ کس کا عمل دنیا میں کیا رہا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کے حکیم اور عادل اور حق شناس ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں

باقی رہ جاتے۔ چنانچہ یہی حقیقت تھی جسے ذہن نشین کرانے کے لئے قرآن مجید نے یہ فرمانے کے بعد کہ "اللہ جس پر چاہتا ہے کرم کی نظر کرتا ہے۔" (وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَشَآءُ) یہ کہنا بھی ضروری سمجھا کہ "اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکیم ہے۔" (وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ توبہ، ۱۵) یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ کی مشیت آنکھ بند کر کے فیصلے کرتی ہے۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی فیصلے کرتی ہے پورے علم و آگہی کے ساتھ، اور حق و انصاف کے مطابق ہی کرتی ہے، اور حکمت و دانائی کا کوئی تقاضا فراموش نہیں ہونے پاتا۔

(۵) پانچویں بات یہ کہ صفاتِ الٰہی کے اظہار و بیان کے لئے قرآن نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر وہی الفاظ ہیں جو انسانوں کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً علیمؔ، خبیرؔ، سمیعؔ، بصیرؔ، عزیزؔ، شکورؔ، رؤفؔ، رحیمؔ، حکیمؔ، عادلؔ اور متکلمؔ وغیرہ۔ لیکن یہ صرف لفظ کا اشتراک ہے، حقیقت کا اشتراک نہیں ہے۔ یعنی جس وقت یہ الفاظ انسان کے لئے بولے جاتے ہیں ان کی حقیقت اور معنویت کچھ اور ہوتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو دوسری ہوتی ہے۔ پہلی شکل میں ان کا مفہوم بہت ہی محدود اور ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے، جب کہ دوسری شکل میں لامحدود اور اعلیٰ ترین قسم کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر علمؔ کی صفت کو لے لیجئے۔ علیم اللہ تعالیٰ بھی ہے اور انسان بھی ہے، مگر اللہ کا علیم ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ:۔ وہؔ ہر بات جانتا ہے خواہ اس کا تعلق کسی زمانے، کسی جگہ اور کسی معاملے سے ہو، اسؔ کا یہ جاننا کبھی غلط اور خلافِ واقعہ نہیں ہوتا۔ یہ علمؔ اس کی ذاتی صفت ہے نہ کہ کسی کی بخشی ہوئی، یا کہیں سے حاصل کی ہوئی، ازلی اور ابدی صفت ہے، نہ کہ حادث اور فانی۔۔ اس کے بخلاف انسان کا علیم ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ:۔ وہؔ بس کچھ تھوڑی سی باتوں کو جانتا ہے اور وہ بھی نہایت محدود معنوں میں، مستقبل کے بارے میں تو اس کا علم صفر کے برابر ہے ہی، ماضی کے بارے میں بھی وہ کچھ بہت دور تک نہیں جا سکتا۔ حتیٰ کہ حال اور موجود کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا، جو کچھ جانتا ہے ضروری نہیں کہ وہ صحیح اور مطابقِ واقعہ ہی ہو۔ اسؔ کی یہ صفت ذاتی نہیں ہے، بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی ہے اور کسی شخص کو صرف اتنی ہی مقدار میں حاصل ہوتی ہے جتنی کہ اس نے اسے عنایت فرمائی ہو۔ جسؔ طرح وہ خود حادث اور فانی ہے اسی طرح، بلکہ

اس سے بھی زیادہ، اس کی یہ صفت بھی حادث اور فانی ہے ۔ غرض اللہ کے علیم ہونے اور انسان کے علیم ہونے میں اس سے بھی زیادہ فرق ہے جتنا فرق کہ پورے سمندر اور بارش کے ایک قطرے میں ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ دوسری تمام صفتوں کا بھی ہے۔

اس سلسلے میں یہ اعتراض کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ جب حقیقتِ واقعی کا اتنا عظیم فرق تھا تو پھر قرآن مجید نے صفاتِ الٰہی کے اظہار و بیان کے لئے ایسے الفاظ استعمال ہی کیوں کئے؟ یہ اس لئے کہ آخر اس کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا؟ یہ تو ایک مسلّمہ بات ہے کہ قرآن ہم انسانوں ہی کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اور یہ غرض پوری نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ غیب کے حقائق سے بھی، جن کا یہ صفاتِ الٰہیہ ایک اہم حصّہ ہیں، ہمیں مطلع نہ فرما دیا جاتا، کیونکہ یہی حقائق تو دین و ہدایت کی اصل بنیاد تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حقیقتوں کی ہمیں تعلیم کس طرح دی جاتی؟ کیا اس کی سبیل اس کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتی تھی کہ انہیں ہماری (انسانی) زبان ہی میں اور ہمارے الفاظ کے توسط ہی سے بیان فرمایا جاتا؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اس کے سوا اور کوئی سبیل قطعاً ممکن نہیں تھی۔ اس لئے دوسرے امورِ غیب کی طرح صفاتِ الٰہی کے بیان و تعلیم کے لئے بھی بجا طور پر ہمارے جانے بوجھے الفاظ ہی استعمال کئے گئے۔ اب رہ جاتا تھا اس امر کا اندیشہ کہ کہیں کم فہم لوگ اس اشتراکِ لفظی کی وجہ سے الٰہی صفات کو بھی انسانی صفات ہی پر نہ قیاس کر بیٹھیں، تو اصولی اور تفصیلی دونوں طرح سے اس کا پورا پورا تدارک کر دیا گیا، اصولی تدارک کے لئے یہ بات فرما دی گئی کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ"، (کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے مشابہ نہیں ہے۔ شوریٰ) وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (آسمان و زمین میں ہر کہیں، اسی کی شان سب سے بالا ہے۔ روم) تفصیلی تدارک کے لئے مختلف صفات کے ضمن میں ایسی وضاحتیں فرما دی گئیں جن کے بعد اس طرح کی کسی غلط فہمی کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ مثلاً اسی صفتِ علم ہی کے مسئلے کو لیجئے۔ قرآن مجید نے جہاں اللہ تعالیٰ کو "علیم" فرمایا وہیں جا بجا اس "علمیت" کی وضاحت بھی اس طرح کر دی کہ "وہ ہر بات کو جانتا ہے۔" وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (بقرہ) وہ دلوں کے اندر تک جانتا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ

الصُّدُوْرِ۔ آل عمران) " وہ ہر چھپی اور کھلی بات سے باخبر ہے"، (عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَۃِ۔ حشر) وہ پوری کائنات کے چھپے ہوئے حقائق سے (بھی) بخوبی آگاہ ہے"اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ حجرات) اسی طرح دوسری صفتوں کے سلسلے میں بھی ضروری وضاحتیں فرمادی گئی ہیں۔

(۶) قرآنِ حکیم نے ذات و صفاتِ الٰہی کے تصوّرات پیش کرتے وقت صرف ایک ذہن' عام انسانی ذہن کو سامنے رکھا ہے، نہ کہ کسی خاص طبقے کے ذہن کو' اور ایسی موشگافیوں سے قطعی اجتناب کیا ہے جو اس عام ذہن کے لئے ناقابلِ تحمّل ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس نے اس بارے میں 'عوام' اور 'خواص' کی تفریق نہیں کی ہے ایسا نہیں کیا ہے کہ خواص کے لئے تو کچھ اور فرمایا ہو، اور عوام کے لئے کچھ اور۔ خواص کو کچھ ایسے تصوّرات دیئے ہوں جو فلسفے کے خیالاتِ مجردہ سے ترکیب پائے ہوئے ہوں، اور عوام کو ایسے تصوّرات دیئے ہوں جو محسوسات کے خط و خال رکھتے ہوں۔ اس کے بخلاف اس نے بلا استثناء تمام انسانوں کے سامنے اللہ کی ذات و صفات کے تصورات بالکل یکساں نوعیت کے رکھے ہیں۔ یہ بات اس نے جس عظیم مصلحت کی خاطر اختیار فرمائی ہے وہ کسی ایسے شخص پر مخفی نہیں رہ سکتی جو یہ جانتا ہو کہ آسمانی کتابیں فی الواقع کس غرض سے نازل ہوتی رہی ہیں؟ اور انسانی زندگی کا وہ کون سا انقلاب ہے جسے برپا کرنے کے لئے قرآن کا نزول ہوا ہے؟

جب قرآن مجید اپنی اس سب سے اہم اور بنیادی اصطلاح، یعنی "اللہ"، کے لفظ کا استعمال کرتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے جو اوپر کی اس پوری بحث کے پڑھنے کے بعد ذہن میں آتا ہے۔ نہیں معلوم کسی اور مذہب اور مذہبی زبان کی کوئی اصطلاح اس مفہوم کی ٹھیک ٹھیک حامل ہے یا نہیں؟ اگر ہے، تو 'اللہ' کا ترجمہ اس لفظ سے کر دینے میں کوئی حرج نہیں' ورنہ ظاہر ہے، ایسا کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔

نبی اور رسول

قرآن کی دوسری اہم ترین اصطلاح 'نبی' اور 'رسول' کی ہے۔ نبی اور رسول وہ شخص ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی ہدایت نازل ہوتی ہے، تاکہ وہ اس پر خود بھی عمل کرے اور اسے اللہ کے دوسرے بندوں تک بھی پہنچائے۔

'نبی' لغت میں 'اونچی زمین' کو بھی کہتے ہیں اور 'نشانِ راہ' کو بھی۔ اسی طرح 'رسول' کے

لغوی معنی 'بھیجے ہوئے' کے ہیں، خواہ وہ کوئی پیغام ہو، خواہ پیغامبر ہو۔ گویا اس شخص کو، جس پر اللہ کی ہدایت نازل ہوتی ہے، 'نبی'، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے تمام انسانوں سے اونچا بھی ہوتا ہے اور ان کے لئے فلاح و نجات کی راہ راست کا نشان بھی ہوتا ہے، اسی طرح اسے 'رسول'، اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے اس کی رعایا کے پاس بھیجا ہوا پیامبر، اور ایلچی ہوتا ہے، جو انہیں اُس کے احکام پہنچاتا ہے۔

'نبی'، اور 'رسول'، کی شخصیت کے بارے میں قرآن مجید نے حسب ذیل صراحتیں کی ہیں:۔

(۱) وہ انسان، اور صرف انسان ہوتا ہے، ٹھیک ہمارے اور آپ ہی جیسا انسان چنانچہ بلا استثناء سارے ہی انبیاء اپنے بارے میں "اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" کا نہایت واضح لفظوں میں اعلان کرتے رہے ہیں (ابراہیم) پھر انسانوں میں سے بھی صرف مردوں ہی کو نبی بنایا جاتا رہا ہے، عورتوں میں سے کسی کو اس کام کے لئے کبھی منتخب نہیں کیا گیا۔ (مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (یوسف) انبیاء جب انسان تھے تو قدرتی طور پر دوسرے انسانوں کی طرح مادّی ضرورتیں اور بشری تقاضے وہ بھی رکھتے تھے، جیسا کہ فرمایا بھی گیا ہے " بیشک یہ لوگ کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے" (اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ۔) (فرقان) اور یہ کہ "ہم نے ان کو بیوی بچوں والا بنایا تھا"، (وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً۔ رعد)

ان ساری وضاحتوں کے بعد اگرچہ انبیاء علیہم السلام کا بشر ہی ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے، مگر مسئلے کی اہمیت چاہتی تھی کہ منفی پہلو سے بھی کسی غلط فکری کی گنجائش باقی نہ رہنے دی جائے، اس لئے یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ انبیاء فرشتے نہیں ہوتے تھے (قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا بنی اسرائیل) اور نہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ 'اوتار' لیتا اور خود ہی انسانی قالب اختیار کر کے دنیا میں آجاتا رہا ہو۔ چنانچہ عیسائیوں کے ایک گروہ نے جب یہ کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے تو قرآن نے اسے 'کفر' قرار دیا (لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ (مائدہ)

(۲) نبی اور رسول ہونا، یعنی نبوت اور رسالت، ایک منصب ہے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص افراد کا انتخاب اور تقرر ہوتا ہے۔ (اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ۔ حج) اس سلسلے میں ان منتخب اور مقرر ہونے والے افراد کے نہ اپنے ارادے کا کوئی دخل ہوتا ہے نہ اپنی کسی کوشش کا، انسان کے اپنے عزم و ارادے اور سعی و کوشش سے یہ چیز حاصل نہیں ہوا کرتی، یہ اللہ ہی ہے جو اس امر کا فیصلہ کیا کرتا ہے کہ اپنا رسول کسے بنائے (اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ انعام) ذکر و فکر اور ریاضت سے انسان روحانی طور پر بہت اونچا اُٹھ سکتا ہے، اور اپنے اندر ملکوتی صفات کا رنگ پیدا کرلے سکتا ہے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے ان مجاہدوں کے بل پر مقامِ رسالت تک پہنچ جائے، اور اپنی ان ریاضتوں کی بدولت خلعتِ نبوت سے سرفراز ہوجائے۔ کیونکہ، جیسا کہ ابھی معلوم ہوا، نبوت ایک منصب اور ڈیوٹی ہے، اور کوئی منصب از خود، محض اپنی کوششوں سے نہیں ملا کرتا، بلکہ کسی حاکمِ مجاز کے فرمان اور تقرر ہی سے ملا کرتا ہے۔ اسلئے نبوت بھی، جو ایک عظیم ربانی منصب ہے، اسی کو مل سکتی ہے جس کے لئے کائنات اور انسان کے حاکمِ حقیقی کا حکمِ تقرر نافذ ہوچکا ہو۔

(۳) نبی جو ہدایت بھی دیتا ہے، اور دین و شریعت کے طور پر جس بات کی بھی تلقین کرتا ہے، وہ اس کی اپنی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر نبی لوگوں سے یہی کہتا رہا ہے کہ "میں تمہیں اپنے پروردگار کے احکام سُنا رہا اور اسی کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ (اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ اعراف) اور جب نبی کی ہر بات اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی اطاعت کرنا دراصل اللہ کی اطاعت کرنا، اور اس کی نافرمانی کرنا فی الواقع اللہ کی نافرمانی کرنا ہے۔ جیسا کہ صراحت سے فرمایا بھی گیا ہے کہ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"، (وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ نساء) اور یہ کہ ہم نے یعنی (اللہ نے) جس رسول کو بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ اُس کی اذنِ خداوندی کے مطابق اطاعت کی جائے"، (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ (نساء) "خود رسول کا لفظ بھی بتاتا ہے کہ امرِ واقعی یہی ہوسکتا ہے۔

کیونکہ اللہ کے رسول، یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ کہے گا اپنی ذاتی حیثیت سے اور اپنی طرف سے نہیں کہے گا، بلکہ اپنے بھیجنے والے کی طرف سے کہے گا، اور اسلئے اس کی اطاعت یا اس کی نافرمانی بھی اس کی شخصی اطاعت یا نافرمانی نہ ہوگی بلکہ اللہ رب العلمین ہی کی اطاعت اور اسی کی نافرمانی ہوگی۔

ان تصریحات سے 'نبی' اور 'رسول' کی قرآنی اصطلاح کا جو مفہوم متعین ہوتا ہے، آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ خدا رسیدگی اور مذہبی عظمت و تقدس ظاہر کرنے والے دوسرے بیشمار الفاظ و اصطلاحات کے مفہوموں سے وہ بنیادی طور پر مختلف ہے۔ بزرگ، ولی، پیر، فقیر، سادھو، سنت، گرو، رشی، منی اور اسی طرح کے دوسرے لفظوں میں سے کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو اس مفہوم کا حامل ہو۔ اس لئے یہ قرآنی اصطلاح اپنی حقیقت اور حیثیت کے اعتبار سے ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے تصور اور مفہوم کی تعبیر کے لئے اسی کو استعمال کیا جانا چاہیئے۔ اور اگر کسی دوسرے لفظ سے اس کا ترجمہ کیا بھی جائے تو اسی شکل میں جب کہ وہ ٹھیک ٹھیک اسی تصور کو پیش کرتا ہو، اور لوگ اسے سُن کر اس کا یہی مفہوم سمجھتے ہوں۔ چنانچہ فارسی زبان کا لفظ 'پیغمبر' اسی طرح کا ایک لفظ ہے۔

آخر میں 'نبی' اور 'رسول' کے ایک فرق کو بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ فرق ان دونوں لفظوں کے استعمال کا ہے۔ قرآن مجید نے اگرچہ ان دونوں ہی لفظوں کو اُس مخصوص مفہوم کی حامل اصطلاح ٹھیرالیا ہے جس کی وضاحت ابھی ہمارے سامنے آچکی ہے۔ لیکن 'نبی' کا لفظ جس طرح اسی اصطلاح اور اسی مفہوم کے لئے مخصوص ہے 'رسول' کا لفظ اس طرح مخصوص نہیں ہے 'نبی' کا لفظ تو ایسا ہے کہ قرآن جب بھی اسے بولتا ہے، اسے قطعی طور پر وہی خاص انسان مُراد ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوئی ہے۔ لیکن 'رسول' کا لفظ 'نبی' کی ہم معنی اصطلاح ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر مقامات پر اپنے لغوی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے، یعنی وہ انبیاء کے لئے بھی بولا گیا ہے، اور غیر انبیاء کے لئے بھی۔ چنانچہ جگہ جگہ فرشتوں کو بھی 'اللہ کے رسول' کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف ڈیوٹیوں پر مامور اور بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر 'رسول' کے لفظ کو قرآن کے اندر کہاں نبی کی ہم معنی اصطلاح

سمجھا جائے، اور کہاں لغوی معنی میں بولا ہوا سمجھا جائے؟ تو اس بارے میں قرائن ہی رہنمائی کریں گے، جو واضح شکل میں ہر جگہ آپ کو موجود ملیں گے۔

وحی

قرآن مجید کی تیسری اہم اصطلاح 'وحی' کی ہے۔ 'وحی' اس ہدایت کو فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی پر نازل ہوتی ہے۔

'وحی' کے اصل لغوی معنی 'تیز اشارے' کے ہیں، خواہ وہ ہاتھ سے ہو، نگاہ سے ہو، آوازِ محض سے ہو، کلام سے ہو، تحریر سے ہو، غرض جس طرح بھی ہو۔ پھر چونکہ 'اشارہ' کسی کو کسی بات سے باخبر کرنے ہی کے لئے ہوتا ہے، دوسری طرف اس میں خِفا کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے، اس لئے اس لفظ کے معنی خفیہ اطلاع دہی کے 'پوشیدہ تلقین' کے۔ اور دل میں کوئی بات ڈال دینے کے بھی ہو گئے۔ اس لفظ کا مصدر 'ایحاء' ہے۔ جس سے بننے والے افعال انہی سب مختلف معنوں میں، اور کسی تخصیص کے بغیر ہر شے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ افعال اللہ، انسان، شیطان، سبھی کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، لیکن جب بات ان افعال کے استعمال کی نہ ہو، اور خود یہ لفظ 'وحی' بولا جا رہا ہو تو پھر اس وقت معنی اور استعمال کی یہ وسعت ختم ہو جاتی ہے، اور اس سے مراد مخصوص طور پر صرف وہ کلامِ ہدایت ہوتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی جناب سے موصول ہوتا ہے، اور ایسے طریقے سے موصول ہوتا ہے جو عام انسانی حواس کی گرفت سے ماوراء ہوتا ہے۔ یعنی خاص 'وحی' کا لفظ قرآن کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور وہ ہر جگہ اسی اصطلاح کی حیثیت سے بولا گیا ہے، جب کہ 'ایحا' اور اس سے بنے ہوئے افعال کی حیثیت اصطلاح کی نہیں ہے اور وہ اپنے عام لغوی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ 'وحی' صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اور صرف اس کے نبیوں کے لئے ہوتی ہے، جب کہ 'ایحاء' اللہ اور غیر اللہ سبھی کی طرف سے ہوتا ہے اور ہر مخلوق کے لئے ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی ہدایت کو 'وحی' اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس کا

نزول دوسرے انسانوں کی نظروں سے مخفی ہوتا ہے۔

'وحی' صرف معانی کا نام نہیں ہوتی، بلکہ اس میں معانی، الفاظ اور ترتیبِ الفاظ، سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر جو ہدایت نازل ہوتی ہے جس طرح اس کے معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی اسی کی طرف سے ہوتے ہیں، اور ان الفاظ کی وہ ترتیب بھی، جس سے کہ وہ عبارت کی شکل اختیار کرتے ہیں، اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس 'وحی' کو صریح لفظوں میں 'کلام اللہ' (اللہ کا کلام) بھی فرمایا گیا ہے۔

اس 'وحی' (یعنی قرآن مجید) کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کو نزول' (اترنا) یا 'انزال' اور 'تنزیل' (اتارنا یا اتارا جانا) فرمایا گیا ہے۔ یہ 'نزول' کیا چیز تھی، اور یہ 'اترنے' یا اتارے جانے' کا عمل کس طرح وجود میں آتا تھا؟ اس بارے میں قرآن اور صحیح احادیث سے جو وضاحت ملتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(الف) اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فرشتہ، جس کا نام جبرئیلؑ ہے، اس کا یہ کلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر اتارا کرتا تھا:۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۝ عَلٰی قَلْبِكَ۔ (شعرآء)	"اے نبی! امانت دار فرشتے (جبریل) نے اس (قرآن) کو تمہارے قلب پر اتارا ہے۔
فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِهٖ (بقرہ)	تو یقیناً اس نے اس کے (یعنی اللہ کے) حکم سے اُسے تمہارے قلب پر اتارا ہے۔"

غرض یہی فرشتہ قرآن کو آنحضرتؐ تک پہنچانے کا ذریعہ تھا۔ اللہ تعالیٰ جس وقت جتنی آیتیں نازل کرنا چاہتا تھا، انہیں حضرت جبریلؑ کے حوالے کرکے آپؐ کے پاس روانہ فرما دیتا، اور وہ پوری امانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ ان آیتوں کو لاکر آپؐ کے قلب پر نازل کر دیتے۔ اس سلسلے میں ان کی حیثیت قطعی طور پر محض ایک واسطے اور فرمانبردار خادم کی تھی' اس میں ان کی اپنی رائے اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوا کرتا تھا۔ نہ تو حکمِ الٰہی کے بغیر وہ کبھی آتے تھے، جیسا کہ دوسری آیت کے الفاظ "بِاِذْنِهٖ" سے ظاہر ہے، اور جیسا کہ ایک اور آیت

ہیں خود اُن ہی کی زبان سے یہ صراحت مذکور ہے کہ "اے نبی! جب بھی ہم (وحی لے کر) اترتے ہیں، تیرے رب کا حکم ملنے ہی پر اترتے ہیں" (وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ مریم)، اور نہ اس "وحی"، اور "کلام الٰہی" میں کوئی کمی بیشی یا کسی طرح کا کوئی ادر تغیر ہونے دیتے تھے، جیسا کہ انہیں "اَلرُّوْحُ الْاَمِیْنُ" (امانت دار فرشتہ) کہہ کر وضاحت فرمادی گئی ہے۔

قرآن مجید میں بعض مقامات پر اس بات کو کہ جبریلؑ نے اس قرآن کو نبیؐ کے قلب پر اتارا ہے، اس طرح بھی فرمایا گیا ہے کہ:۔

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی۔ (النجم)	یہ قرآن اللہ کی) بھیجی ہوئی وحی کے سوا کچھ نہیں، جس کی زبردست قوتوں والے (فرشتے) نے اسے (یعنی نبی کو) تعلیم دی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "قلب پر اتارنے" کا مفہوم کوئی معمولی نوعیت کا نہ تھا، بلکہ "تعلیم" کا یعنی پوری طرح سکھا دینے کا تھا، جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی یہ وحی اپنی اصلی شکل میں، جوں کی توں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد ہو جاتی تھی۔

(ب) جس وقت حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر وحی کا یہ نزول ہوتا تھا، اس وقت آپؐ پر انتہائی استغراق کی کیفیت چھا جاتی، اور آپ گردوپیش سے یکسر منقطع ہو جاتے، چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا، اور صاف نظر آتا کہ آپؐ کے اعصاب پر بڑا سخت بار پڑا ہوا ہے، اور آپؐ تھکے جا رہے ہیں۔ سردی کے زمانے میں بھی جبینِ اقدس پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے۔ (بخاری باب کیف کان بدء الوحی) اگر آپ سواری پر ہوتے تو کجاوے سے چرچراہٹ کی آوازیں تک آنے لگتیں (فتح الباری جلد ۱)

ایک بار حضرت حارثؓ بن ہشام صحابی نے پوچھا کہ آپؐ پر وحی کس طرح اُترتی ہے؟ فرمایا "کبھی تو اس طرح جیسے میرے کانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ نزولِ وحی کا یہ انداز مجھ پر بڑا سخت گذرتا ہے۔ پھر فرشتہ اللہ کا کلام مجھے پہنچا کر چلا جاتا ہے، اور میں اسے پوری طرح محفوظ کر چکا ہوتا ہوں، اور کبھی اس طرح کہ فرشتہ انسانی شکل اختیار کر کے میرے سامنے آموجود ہوتا ہے، اور مجھے جو کچھ سنانا ہوتا ہے سُنا دیتا ہے۔ اور میں اس کا سنایا ہوا

کلام یاد کر لیتا ہوں"۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ فرشتہ دو ہیئتوں میں آیا کرتا تھا:۔ ایک تو انسانی ہیئت میں دوسرے اپنی اصل ہیئت میں۔ اس دوسری شکل کے بارے میں آپؐ کا یہ فرمانا کہ وہ مجھ پر "اَشَدُّ" (زیادہ سخت) ہوتی ہے، ظاہر کرتا ہے کہ شدت اور سختی کے وجود سے پہلی شکل بھی خالی نہ تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرشتے سے وحی کا اخذ کر لینا بہر حال ایک غیر معمولی عمل ہوتا تھا، اور اسے "سیکھنے سکھانے" کا معروف عمل و طریق عمل ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ فرشتے سے وحی کے اخذ کر لینے کے لئے آپؐ ظاہری حواس سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ اپنی باطنی قوتوں کو مجتمع کر کے کسی اور عالم میں منتقل ہو جاتے تھے، اور اس طرح عالمِ ظاہر سے بلند ہو کر وحیِ الٰہی کو اپنے قلب پر اتار لینے کے قابل ہوا کرتے تھے۔ یہ استغراق کی حالت، یہ چہرۂ مبارک کی سُرخی، یہ جبینِ اقدس کا پسینے سے تر ہو جانا، اور یہ کانوں میں گھنٹیوں کی سی آواز کا محسوس ہونا اسی بات کا نتیجہ ہوا کرتا تھا۔ بہر حال حقیقت کا صحیح علم تو اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ ہمارے سامنے اس نزولِ وحی کی بات جس حد تک واضح ہے وہ صرف اتنی ہے کہ اس طرح کی کیفیت ہوتی تھی جس میں آپؐ کو فرشتہ اللہ کی وحی منتقل کرتا، اور یہ کیفیت صریح طور پر حالتِ بیداری کی ہونے کے باوجود عالمِ ظاہر سے کٹ جانے کی ہوتی تھی، کچھ اسی طرح کٹ جانے کی، جس طرح کی کہ ہماری آپ کی حالت خواب میں ہوا کرتی ہے۔

یہ ہیں وہ باتیں جو اس مسئلہِ نزولِ وحی کے بارے میں ہمیں بتائی گئی اور ہمارے علم میں آسکی ہیں۔

اب رہا مزید بحث و تحقیق کا معاملہ، یعنی یہ سوال کہ وحی کا یہ نزول فی الواقع ہے کیا چیز؛ تو یہ سوال دوسرے لفظوں میں در اصل یہ سوال ہے کہ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ لیکن کیا عام انسان وحی کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے؟ قرآن کا جواب یہ ہے کہ نہیں، چنانچہ جن دنوں وہ نازل ہو رہا تھا، اس کے حجت باز مخالفوں نے براہِ راست یہ سوال اٹھایا بھی تھا کہ یہ "وحی کیا چیز ہے؟ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ، تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو ہدایت فرمائی کہ "کہہ دو، وحی میرے رب کے خاص) امور میں سے ہے، اور تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔" (قُلِ

الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ۔ بنی اسرائیل) یعنی انسان جاننے اور سمجھنے کی جو فطری صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا ہے، وہ اتنی اور ایسی نہیں کہ اس کے لئے وحی کی حقیقت کا سمجھ لینا ممکن ہو سکے۔ عقلی طور سے دیکھئے تو یہ ایک معقول ترین جواب تھا۔ کیونکہ نبوت اگرچہ انسانوں ہی کو عطا فرمائی جاتی رہی ہے مگر وہ عام بشری قوتوں سے قطعاً ایک زائد قوت ہے، اور اس کی حقیقت صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے خود اس سعادت سے سرفراز فرمایا گیا ہو، کوئی بچہ اگر سنِ رشد کے محسوسات کو، اور کوئی سادہ لوح ان پڑھ اگر علمی حقائق کو نہیں سمجھ سکتا، حالانکہ اس کے اندر انہیں سمجھ لینے کی صلاحیت اگرچہ بالفعل موجود نہیں ہوتی مگر بنیادی طور پر اور بالقویٰ بہرحال موجود ہوتی ہے، .... تو نبوت کے مخصوص امور کو کوئی غیر نبی کیسے سمجھ سکتا ہے، جب کہ اس کے اندر انھیں سمجھ سکنے کی صلاحیت — بنیادی طور سے اور بالقویٰ بھی موجود نہیں ہوتی؟ البتہ کسی شے کی حقیقت اور اصل نوعیت کا ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا اور بات ہے، اور اُس کا ایک مبہم سا اندازہ لگا لینا دوسری بات ہے۔ پہلی بات اگر ہمارے لیے ناممکن ہو تو ضروری نہیں کہ دوسری بھی ناممکن ہی ہو۔ اس کے بخلاف صورتِ واقعہ اکثر اس کے برعکس ہی ہوا کرتی ہے۔ کتنی ہی اشیاء ایسی ہیں جن کی حقیقتوں کو نہیں پایا جا سکا ہے، لیکن پھر بھی مثالوں کے ذریعے اور ارد گرد کی مختلف معلومات کی مدد سے ہمارے قیاس کی نگاہیں ان کے جلووں کی جھلک دیکھ ہی لیتی ہیں۔ چنانچہ 'وحی' اور اس کے نزول کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے، بلاشبہ ہم نہیں جانتے، اور نہیں جان سکتے کہ وحی کی اصل نوعیت اور حقیقت کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمارے علم اور تجربے میں کچھ ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جن کو اگر ہمارا قیاس وزینہ، بنالے تو اس کی جھلکیوں کا ایک نظارہ، دور ہی کا سہی، بہرحال کر لیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں میں سب سے اہم اور نمایاں چیز سچے خواب ہیں۔ ان خوابوں کا حال یہ ہے کہ ایک واقعہ جو ابھی آئندہ کسی وقت پیش آنے والا ہے، ایک سوتے ہوئے انسان کو، تمدے رمزیہ اندازمیں، ابھی پیش آتا دکھائی دے جاتا ہے، اور اس طرح اسے کل ہونے والی بات کی اطلاع ایک خاص شکل میں آج ہی مل جاتی ہے۔ غور فرمائیے، آئندہ پیش آنے والا ایک واقعہ انسانی ذہن کو، جس وقت کہ وہ اپنے گردوپیش سے یکسر بے خبر اور بے تعلق ہوتا ہے، پہلے ہی کیسے محسوس ہو جاتا ہے، اور کہاں سے

اور کس طرح اسے اس کی اطلاع مل جاتی ہے؟ جن لوگوں کو اس کائنات کے پیچھے کسی اَن دیکھی قوت کا، اور کچھ بلند حقائق کا وجود ہی تسلیم نہیں، وہ تو اس بارے میں نہ جانے کیا کچھ کہا کرتے ہیں، لیکن خدا پر اور اس کی شانِ کبریائی پر یقین رکھنے والا اسے اس کے سوا اور کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دراصل عالمِ بالا کا ایک فیضان ہے، جس سے کبھی کبھی بندوں کو نوازا جاتا رہتا ہے' یعنی غیب کا جاننے والا اور واقعات کو ظہور میں لانے والا انہیں خواب کی حالت میں، ایک خاص طریقے پر' پہلے ہی سے بتا دیا کرتا ہے کہ آئندہ اس طرح کا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ خواب میں عالمِ غیب سے بعض باتوں کا اس طرح معلوم ہو جانا ایک ایسی واقعیت ہے جس کا انسان کو برابر تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ اس تجربے کے ہوتے ہوئے 'وحی کا نزول اور اللہ تعالیٰ کی جناب سے بعض خاص بندوں تک ہدایت کا پہنچنا' ناقابلِ فہم ہو تو ہو، مگر ناقابلِ تصوّر ہرگز نہیں رہ جاتا۔ البتّہ جب ایک عام انسان یہی نہیں جان سکتا کہ خود اس کے ذہن پر نیند کی حالت میں فلاں بات کس طرح منکشف ہو گئی، اور اس کے اس خواب کی حقیقت کیا ہے، تو وہ وحی اور نزولِ وحی کی حقیقت کو کیسے جان سکتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مسلمان کے (سچے) خواب، نبوت کا چھیالیسواں جزو ہیں"۔ (رُؤْيَا الْمُسْلِمِ جُزْءٌ مِّنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءً مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ ترمذی، ابواب الرویا) اسی طرح خود آپؐ کا حال بھی یہ ہے کہ نزولِ وحی کی ابتداء ہونے سے پہلے مسلسل چھ مہینوں کا زمانہ 'سچے خوابوں' ہی کا زمانہ تھا یعنی اس مدّت میں آپؐ اکثر خواب دیکھا کرتے، اور جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ بعد میں عالمِ واقعہ کے اندر نظروں کے سامنے آجاتا۔ گویا یہ زمانہ آپؐ کی عام انسانی حالت اور آپ کی نبوّت کے درمیان کا ایک 'عبوری' زمانہ تھا، اور یہ خواب ایک طرح سے نبوت کی 'تمہید' تھے۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ سچے خوابوں کا وجود، وحی اور نزولِ وحی کی نوعیت کا ایک مبہم سا تصور ضرور دلا سکتا ہے، کیونکہ انہیں وحی و نبوّت کے معاملے سے ایک طرح کی مناسبت حاصل ہے۔ غالبًا یہ بھی ایک اہم غرض اور مصلحت تھی جس کے پیشِ نظر رویائے صالحہ، (سچے اور اچھے خوابوں) کو انبیاءِ کرام ہی کے لئے مخصوص نہیں رکھا گیا، بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی عام کر دیا گیا ہے، نیز وحی کا سلسلہ ختم ہو جانے

کے باوجود سچّے خوابوں کا دروازہ قیامت تک کے لئے کُھلا رکھا گیا ہے، تاکہ نزولِ وحی کی نوعیت کا، کم از کم ایک ابتدائی تصوّر کر سکنے کے لئے ایک دور کی مثال اور رہنمائی ہمیشہ موجود رہے۔

ملائکہ

قرآن مجید میں ایک خاص مخلوق "ملائکہ" (یعنی فرشتوں) کا تذکرہ کثرت سے آیا ہے، اور مختلف وجوہ سے یہ لفظ بھی قرآنِ کریم کی اہم ترین اصطلاحوں میں سے ایک ہے، خصوصًا اس لئے کہ یہی فرشتے ہیں جن میں کے بعض افراد انبیاء علیہم السلام تک اللہ کی 'وحی' کے پہنچانے کا ذریعہ رہے ہیں۔ پھر اس لئے بھی کہ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی شان و عظمت، عام طور سے لوگوں کے لئے فتنہ بنتی رہی ہے، اور جن کی تعظیم میں غلو کر کے انسان شرک، کفر اور بت پرستی کی مہلک گمراہیوں میں مبتلا ہوتا رہا ہے۔ کہیں اُنھیں 'معاذ اللہ' اللہ تعالیٰ کی اولاد بنا دیا گیا تو کہیں انھیں مختلف صفاتِ الوہیت ہی کے دوسرے نام سمجھ لیا گیا، اور اس طرح دیوی دیوتاؤں کا تخیل وجود میں آ گیا، اس لئے ضروری ہے کہ ان کے بارے میں بھی قرآن کا متعیّن کیا ہوا تصوّر واضح طور سے سمجھ لیا جائے۔

فرشتے عام انسان کے لئے غیب کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس لئے 'وحی' کی طرح ان کی بھی اصل حقیقت ہم نہیں سمجھ سکتے، اور دینی اغراض و مصالح کے لحاظ سے اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ دینی لحاظ سے ضرورت جس بات کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہمیں ان کی حیثیت اور صفات کا ٹھیک علم ہو، چنانچہ یہی علم ہمیں دیا بھی گیا ہے۔ قرآن مجید کے ارشادات اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحتوں کی روشنی میں فرشتوں کی حیثیت اور ان کی صفات حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی باعزت، بلند مرتبہ اور مقرب مخلوق ہیں (بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ - انبیاء، ۲۶)

(۲) یہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کے پوری طرح پابند رہتے ہیں۔ اگرچہ قرآن یہ تو نہیں بتاتا کہ ان کے اندر احکامِ خداوندی سے سرتابی کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، مگر اس حقیقت

کی بار بار صراحت کرتا ہے کہ عملاً وہ کبھی نافرمانی نہیں کرتے اور کامل اطاعت گذاری ہی ان کا شعار ہے (وَهُمْ بِأَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۔ انبیاء ۔ ۲۷) اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح اور تقدیس میں برابر مشغول رہتے ہیں۔ (نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۔ بقرہ) اور ان پر ہر آن خشیتِ الٰہی چھائی رہتی ہے (وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ انبیاء، ۲۸)

(۳) ان کو غیر معمولی اور بے حساب قوتیں عطا ہوئی ہیں، اور ان کی تعداد حدِ شمار سے باہر، بلکہ ماورائے وہم و گمان ہے۔

(۴) ان کی حیثیت کائنات میں 'اہلِ کارانِ حکومت' کی سی ہے، جو احکام و ہدایاتِ الٰہی کے مطابق اس پورے کارخانۂ عالم کا نظام چلا رہے ہیں۔ ہماری اس دنیا سے لے کر کائنات کے آخری سروں تک جن احکام و تدابیر کا نفاذ ہوتا ہے، انہی 'فرشتوں' ہی کے ذریعہ ہوتا ہے اور ہوتا اس طرح ہے کہ ان کی اپنی رائے اور مرضی کا اس سلسلے میں مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ انہیں اپنے آقا کی طرف سے جو حکم ملا ہوتا ہے، بس اسی کو وہ بجا لاتے ہیں۔ اس طرح انہیں غیر معمولی اور بے حساب قوتیں عطا ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جو عظیم فرائض انہیں سونپے جاتے ہیں اُن کے ٹھیک ٹھیک بجا لانے کی انھیں پوری طاقت دی گئی ہے۔

(۵) مراتب کے اعتبار سے ان کے بے شمار طبقے ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ البتہ بنیادی طور پر ان کے دو طبقے ہیں :۔ طبقۂ عوام، اور طبقۂ خواص ۔ طبقۂ خواص کے ملائکہ کو قرآن مجید نے ایک مخصوص نام "روح" سے موسوم کیا ہے۔ یہ عام ملائکہ سے برتر حیثیتوں کے مالک ہوتے ہیں، اور باری تعالیٰ کے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ احکامِ الٰہی کا فیضان پہلے انہی پر ہوتا ہے، جس کے بعد یہ انہیں لے کر نچلے طبقے کے ان ملائکہ تک پہنچا دیتے ہیں جن کے 'محکمے' سے اُن احکام کا تعلق ہوا کرتا ہے۔ اس طبقۂ خواص کے سرخیل کا نام 'جبرئیل' ہے۔ یاد ہوگا کہ یہی وہ فرشتہ ہے جو انبیاء علیہم السلام تک اللہ تعالیٰ کی 'وحی' پہنچانے کا عظیم فریضہ انجام دیتا رہا ہے، اور جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر قرآن کو اتارا تھا۔

اسلام

اس دین کا نام، جس کی قرآنِ کریم دعوت دیتا ہے اور جو قرآن میں ہے 'اسلام' ہے،

اسلام کے لغوی معنی گردنِ اطاعت خم کر دینے کے، اور اپنے آپ کو حوالہ کر دینے کے ہیں لیکن جب یہ لفظ خالص لغوی مفہوم کے علاوہ دینی تصور کا بھی حامل ہوتا ہے، تو اس وقت اس کے معنی مخصوص طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جانے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینے کے ہوتے ہیں۔ گویا قرآن مجید نے اپنے پیش کئے ہوئے دین کو "اسلام" اس لئے کہا ہے کہ یہ لفظ اس کی حقیقت اور غایت کا بہترین ترجمان تھا، کیونکہ اس کی آمد کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ کے بندے اپنے آپ کو پوری خوشدلی کے ساتھ ان احکام کے حوالہ کر دیں جو اس نے انہیں قرآن کے ذریعہ عطا فرمائے ہیں۔

بلاشبہ صرف اسی دین کی نہیں بلکہ ہر اس دین کی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا تھا، غایت اور حقیقت یہی تھی، اور بلا استثنار سارے ہی آسمانی مذاہب کی آمد کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ اپنی زندگیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اور اس طرح اپنے آقائے حقیقی کے مطیعِ فرمان بن جائیں۔ اس لئے معنوی حیثیت سے ان میں کا ہر ایک دین "اسلام" ہی تھا۔ چنانچہ خود قرآنِ حکیم نے بھی اس حقیقت کا بار بار اظہار کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ جوہر اور مقصد کے اعتبار سے سارے مذاہب ایک ہی تھے، اور جس نبی پر جو کتاب بھی اُتری تھی وہ فی الواقع "اسلام" (کامل اطاعتِ خداوندی) ہی کی دعوت لے کر اتری تھی۔ اس لئے جہاں تک اصل ماہیت کا تعلق ہے، صرف پیروانِ قرآن ہی کا نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کا دین ہمیشہ سے "اسلام" ہی رہا ہے اور نوعِ انسانی ہی پر کیا موقوف ہے، وہ تو یہاں تک صراحت کرتا ہے کہ "اسلام" ہی پوری کائنات کا دین ہے (آل عمران، ۸۳) اور یہ اس طرح کہ ذرہ سے لے کر آفتاب تک، اس جہانِ ہست و بود کی ایک ایک شے انہی قوانین کی اطاعت کر رہی ہے جو اس کے لئے اس کے خالق نے مقرر کر رکھے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود، کہ سارے ہی آسمانی مذاہب اپنے مقصد اور اپنی ماہیت کے لحاظ سے "اسلام" ہی تھے، جہاں تک باضابطہ نامزدگی کا تعلق ہے، قرآن مجید نے مخصوص طور پر صرف اسی دین کو، "اسلام" فرمایا ہے جو اس کا پیش کیا ہوا ہے۔ اس خصوصیت اور امتیاز کی وجہ قرآن اور اس کے پیش کئے ہوئے اس دین کی وہ مخصوص اور امتیازی حیثیت ہے جو اسے دوسری آسمانی کتابوں اور دینوں

کے مقابلے میں حاصل ہے اور جس کا مفصل تعارف "قرآن کے خصوصی امتیازات" کی بحث میں اوپر گزر چکا ہے۔ اس دین کی اس مخصوص اور امتیازی حیثیت نے بجا طور پر اسے حق دے دیا کہ 'اسلام' کا لفظ صرف اس کی حقیقت اور غایت ہی کا ترجمان نہ ہو، بلکہ اس کا نام اور علَم بھی ہو، جب کہ دوسرے دینوں کی حد تک صرف ان کی حقیقتوں اور غایتوں ہی کا ترجمان رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح 'قرآن' فی الواقع ہر آسمانی کتاب تھی، مگر نام اور علَم کے طور پر یہ لفظ صرف اسی ایک کتاب کے لئے مخصوص فرما دیا گیا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہے۔

غرض یہ بھی دین قرآنی کا ایک خاص اور امتیازی وصف ہے کہ نام کے سلسلے میں اس کا انتساب کسی شخصیت یا قومیت کی طرف نہیں ہے، بلکہ اپنی حقیقت اور اپنی غایت کی طرف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک شخص اس کا نام ہی سُن کر اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ دین کیا ہے اور کس بات کی دعوت دیتا ہے؟ جبکہ دنیا کے دوسرے مذاہب اپنے ناموں سے اس طرح کی کوئی رہنمائی نہیں دے سکتے، کیونکہ ان کا انتساب مقاصد اور حقائق کے بجائے شخصیتوں اور قومیتوں کی طرف ہے۔ عیسائیت کا نام عیسائیت اس لئے ہے کہ اس کے پیش کرنے والے حضرت 'عیسیٰؑ' تھے۔ بُدھ مَت کو بُدھ مت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے بانی مہاتما بدھ' تھے۔ زرتشتی مذہب کا نام اپنے پیشوا 'زردشت' کے نام پر ہے۔ یہودیت اسلئے یہودیت ہے کہ بنی اسرائیل (یہودی قوم) میں 'یہودا' قبیلہ بڑی عظمت اور اہمیت حاصل کر گیا تھا اور دوسرے اسرائیلی قبیلے اس کے سامنے اس طرح ماند پڑ گئے تھے کہ پوری قوم ہی پر اس کا نام حاوی ہو گیا۔ اور پھر موسوی شریعت بھی اسی کے نام سے موسوم ہو گئی۔ مگر قرآن نے اپنی دعوت اور اپنے دین کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت یا آپؐ کی قوم کی طرف منسوب کر کے اس کا نام محمدیت یا عربیت یا ہاشمیت نہیں رکھا بلکہ صرف 'اسلام' رکھا، جو اس کی اصولی نوعیت کا، اس کی عالمگیر حیثیت کا، اور اس کی شانِ کمال کا عین تقاضا تھا۔

مومن اور مسلم

قرآن مجید کی اہم اور نمایاں اصطلاحوں میں 'مومن' اور 'مسلم' کی اصطلاحیں بھی ہیں، جو دراصل

ایک ہی جامع حقیقت کے دو رُخ ہیں:۔ ایک علمی رُخ۔ دوسرا عملی رُخ۔ اس لئے کہنا چاہئے کہ بظاہر دو الگ الگ اصطلاحیں ہونے کے باوجود یہ فی الواقع ایک ہی ہیں جیسا کہ آگے کی تفصیل سے واضح ہوگا۔

"مومن" اس شخص کو فرمایا گیا ہے جو قرآن مجید کو صحیح اور اس کے مطلوبہ طریقے پر اللہ کی کتاب تسلیم کرلے، یعنی یہ کہ اس نے جن عقائد یا اصولی حقائق کو اپنی دعوت کی بنیاد قرار دیا ہے اس کا برحق ہونا سچے دل سے مان لے، اور پھر زبان سے بھی اس کا اقرار و اعلان کردے۔ یہ عقائد یا اصولی حقائق پانچ ہیں، اور قرآن کے ان لفظوں میں اکٹھے مذکور ہیں:۔

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ	بلکہ نیکی اس شخص کی نیکی ہے جو مانتا ہو اللہ
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَ	کو، آخری دن کو، فرشتوں کو۔ آسمانی کتابوں
الْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ (بقرۃ)	کو اور نبیوں کو۔

"اللہ کو ماننے" کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسی کو الٰہ و معبود تسلیم کیا جائے اور ساری صفاتِ کمال و صفاتِ الوہیت کو اسی کے لئے مخصوص مانا جائے پھر ان صفات کے فطری لوازم کو بھی بکمال و تمام، اسی کے لئے خاص سمجھا جائے۔ یعنی ان سارے اختیارات کو بھی اور ان سارے حقوق کو بھی ذاتِ باری ہی کے اندر مرکوز تسلیم کیا جائے جو اس کی صفات کے بالکل لازمی تقاضے ہیں۔ مثلاً بندوں کو حکم دینے اور ان کے لئے قانون بنانے کا حقیقی اختیار، ان کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار، التجائیں سننے اور قبول کرنے کا اختیار، انہیں معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار، انہیں نفع یا نقصان، راحت یا مصیبت، تندرستی یا بیماری، زندگی یا موت دینے کا اختیار، اسی طرح اپنی بے چون و چرا اطاعت کرانے کا حق، اپنی مرضیات پوری کرانے کا حق، اپنی پرستش کرانے کا حق وغیرہ (اللہ کا یہی اور اسی طرح ماننا، دعوتِ قرآنی اور اسلام کی اصل بنیاد ہے، اور اس کو توحید کا عقیدہ کہتے ہیں)

"آخری دن کو ماننے" کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے دن کے آنے پر یقین رکھا جائے جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی، سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا، اور اس زمین پر ایک متنفس بھی زندہ باقی نہ رہ جائے گا، اس کے بعد دنیا کے پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک،

سب کے سب دوبارہ زندہ کرکے اللہ کے حضور میں پیش کئے جائیں گے، جہاں ان کے دنیوی اعمال کا مکمل ریکارڈ سامنے رکھا جائے گا، اور ایک ایک فرد کا حساب لے کر نیکی کا اچھا اور برائی کا برا بدلہ دیا جائے گا۔ یعنی جس شخص کا اعمال نامہ ایمان و عمل صالح اور طاعت و بندگی کا اعمال نامہ ثابت ہوگا اسے اللہ تعالیٰ بہترین نعمتوں سے بھری ہوئی دوسری زندگی عطا فرمائے گا جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہوگی، اور جس شخص کے اعمال نامے سے ایمان کے بجائے شرک و کفر، عمل صالح کے بجائے فسق و فجور اور طاعت و بندگی کے بجائے مالکِ حقیقی سے بغاوت کا ثبوت مہیا ہوگا، اسے تکلیفوں بھری زندگی دی جائے گی اور یہ زندگی بھی ہمیشہ باقی رہے گی (یہ دعوت قرآنی اور اسلام کی دوسری اہم ترین بنیاد ہے، اور اسے آخرت کا عقیدہ کہتے ہیں۔)

"فرشتوںؑ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے وجود کو برحق مانا جائے، اور انہیں ٹھیک ان ہی صفات کا مالک سمجھا جائے جن کی وضاحت "ملائکہ" کے زیرِ عنوان اوپر ابھی گزر چکی ہے۔

آسمانیؑ کتابوں کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے جتنی کتابیں بھی نازل ہو چکی ہیں ان سب کو اللہ کی کتاب تسلیم کیا جائے۔ ان میں سے جن کتابوں کے بارے میں اس بات کی یقینی شہادت قرآن نے دے رکھی ہے کہ وہ اللہ کی نازل کی ہوئی تھیں، انہیں تو تعین اور نام کی صراحت کے ساتھ کتابِ الٰہی مانا جائے، اور جن کے بارے میں یہ شہادت موجود نہ ہو ان کے بارے میں صرفُ غیبی' اور اصولی طور پر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ ساری نامعلوم کتابیں بھی اللہ کی کتابیں تھیں۔

آسمانی کتابوں کے ماننے کا ایک ضروری پہلو یہ بھی ہے کہ موجود و معلوم کتابوں میں سے بھی ہر ایک کو وہی حیثیت دی جائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ملی ہوئی ہے۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو آخری کتاب سمجھا جائے، ایسی آخری کتاب جس نے پچھلی ساری کتابوں کو منسوخ قرار دے دیا ہے، اور جس کی عملی پیروی ہی پر اب ہر شخص کی نجات موقوف ہے۔

"نبیوں کو ماننے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شروع سے آخر تک، جتنے انبیاء مبعوث فرما چکا ہے، بلا تفریق ان سب کو اللہ کا نبی تسلیم کیا جائے۔ ان میں سے جن حضرات کا نام

لے کر قرآن مجید نے صراحت کردی ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے، انہیں تو نام کی صراحت اور تعین کے ساتھ نبی مانا جائے، اور باقی کے بارے میں نبی ہونے کا عقیدہ محض 'غیبی' اور اصولی طور پر رکھا جائے۔

اس عقیدے کی ایک ضروری شق یہ بھی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی مانا جائے، اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ آپ کی پیروی پوری نوعِ انسانی کے لئے ضروری ہے۔ یعنی آپ کی بعثت کے بعد سے اس دنیا کی آخری ساعت تک کا زمانہ صرف آپ کی نبوت کا زمانہ ہے، دوسرے تمام انبیاء میں سے ہر ایک کا زمانۂ نبوت بحکمِ الٰہی ختم ہو چکا ہے اور اب کسی اور کی پیروی اللہ کے حضور قابلِ قبول نہ ہوگی۔

" مُسْلِمْ " اس شخص کو کہا گیا ہے جو 'مومن' ہونے کے علمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کوشاں ہو، جو قرآن اور اسلام کا پیرو ہو، جو احکام الٰہی کے آگے اپنے آپ کو ڈال دے۔ چنانچہ اس لفظ کے معنی ہی 'اسلام والے'، یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور طاعت گذار کے ہیں، ظاہر بات ہے کہ قرآن کو ماننا اور اُس کی دعوت کے بنیادی عقائد پر ایمان لانا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے احکام وہدایات کی عملی پیروی بھی نہ کی جائے۔ اس لئے جو شخص بھی قرآن کو مان کر اور اس کے بنیادی عقائد پر ایمان لاکر 'مومن' بن جاتا ہے، اس کے بارے میں فطری اور بدیہی طور پر یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اب وہ اس پورے مجموعۂ ہدایت کو، جس کا نام قرآن اور اسلام ہے، اپنی عملی زندگی کا ہدایت نامہ بنالے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کو تسلیم کرتے ہی ایک شخص صرف 'مومن' ہی نہیں بلکہ 'مسلم' بھی قرار پاجاتا ہے۔

'مسلم' کا لفظ صرف ایک ہی صفت کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ وہ قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کا نام اور عَلَم بھی ہے۔ چنانچہ صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ:-

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج) اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔

گویا جس طرح دینِ قرآنی کا انتساب کسی شخصیت یا قومیت کی طرف نہیں ہے، اسی طرح اُن کے ماننے والوں کا نام بھی ایسے کسی انتساب سے یکسر بلند ہے۔ اس کا نام اگر 'اسلام' ہے تو اِن کا بھی 'مسلم' ہے۔ اور اس طرح خالص صفاتی نوعیت رکھنے کے باعث یہ نام بھی اپنے مسمّیٰ کی

اصولی حیثیت کا خود ہی ترجمان ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ دوسرے لوگ اپنے ملّی مزاج، اپنے موروثی اندازِ فکر اور اپنے عرف ورواج کے زیرِ اثر 'مسلم' اور 'محمڈن' کے فرق کو نہ سمجھ سکیں، اور اس کے نتیجے میں پیروانِ اسلام کو 'مسلم' کہنے کے بجائے 'محمڈن' کہنے لگیں۔

یہی لفظ 'مسلم' ہے جو فارسی زبان میں الف اور نون کے اضافے کے ساتھ 'مسلمان' بن گیا ہے۔

کُفر اور کافر

'کفر' 'ایمان' کی ضد اور مخالف اصطلاح ہے، اس لفظ کے اصل لغوی معنی 'چھپا دینے' کے ہیں۔ اسی طرح 'کافر' کے لغوی معنی بھی، جو اسی لفظ 'کفر' کا اسم فاعل ہے، چھپا دینے والے کے ہوتے ہیں چنانچہ یہ لفظ (کافر) عربی زبان میں ان بہت سی چیزوں کے لئے بطور صفت استعمال ہوتا ہے جو چھپا دینے کا کام کرتی ہیں، مثلاً رات، سمندر اور کسان وغیرہ۔ رات پوری دنیا کو اپنے سیاہ پردوں میں ڈھک لیتی ہے، سمندر اپنے اندر کی مخلوقات کو چھپائے ہوتے ہے، کسان کاشت کرتے وقت دانوں کو زمین میں چھپا دیتا ہے اس لئے لغوی طور پر ان میں سے ہر ایک 'کافر' ہے۔

قرآن کی زبان میں 'کُفر' دو معنوں میں استعمال ہوا ہے، ایک تو 'اللہ تعالیٰ کی ناشکری' کے، دوسرے دین کے بنیادی عقائد میں سے کسی عقیدے کا انکار کر دینے، کے۔ کہنے کو تو 'کفر' کے یہ دو الگ الگ معنی ہیں مگر فی الواقع اس دوئی میں بھی بڑی گہری ہم آہنگی اور فطری وحدت موجود ہے۔ اور اگر دونوں میں کوئی فرق ہے تو صرف اتنا، جتنا کہ بیج اور اس کے پودے میں، یا سورج اور اس سے نکل کر پھیلنے والی روشنی میں ہوا کرتا ہے۔ دراصل کُفر بمعنی انکار، کفر بمعنی ناشکری ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔

'کفر' کے اصل لغوی معنی اور اس کے اصطلاحی مفہوم یا مفہوموں میں جو رشتہ ہے، اسے سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ناشکرا اور منکر جو کچھ کرتا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کو 'چھپاتا' ہے۔ اس کی ربوبیت کے

حق کو چھپاتا ہے۔ اپنی غلامانہ پوزیشن کو چھپاتا ہے، اور آخر میں یہ کہ اپنی اصل فطرت کو جس میں اللہ رب العالمین کی احسان مندی، بندگی اور طاعت شعاری کا احساس سمویا ہوا ہے، چھپا دیتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی ناشکری کو، یا اس کی صفات و لوازمِ صفات کے انکار کو اگر کفر کہا گیا تو یہ ایک جامع ترین اور موزوں ترین تعبیر تھی جو اختیار کی گئی۔

"کفر" اور "کافر" (یعنی کفر والے) کے الفاظ جب قرآن میں بولے جاتے ہیں تو عموماً یہی دوسرے معنی پیشِ نظر ہوتے ہیں: یعنی کافر سے مراد ایسا شخص ہوتا ہے، جو اللہ کی صفات میں سے کسی صفت کا انکار کر دے، یا اس کے لوازم کا انکار کر دے، یا روزِ آخرت کا انکار کر دے، یا نفس وحی و رسالت کا انکار کر دے، یا فرشتوں کے وجود اور ان کی صفات کا انکار کر دے۔ یا کسی پیغمبر کو پیغمبر تسلیم کرنے سے انکار کر دے، یا کسی کتاب الٰہی کو کتابِ الٰہی ماننے سے انکار کر دے۔

کفر، بمعنی انکار کے درجات مختلف ہیں، جس طرح کہ ایمان کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کفر وہ ہے جو امرِ حق کی وضاحت اور معرفت کے باوجود ہوتا ہے۔ اور ایک وہ ہے جس کی بنیاد ناواقفیت پر ہوتی ہے۔ کھلی بات ہے کہ ان دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے از روئے انصاف ان کے نتائج بھی یکساں نہیں ہو سکتے، بلکہ عین ممکن ہے کہ کفر کی بعض صورتیں ایسی بھی ہوں جو کفر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حضور قابلِ درگزر ہوں، نہ صرف یہ کہ ایسا ممکن ہے بلکہ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ واقعہ یہی ہے۔ مثلاً اگر کسی رسول کی دعوت ایک شخص تک نہیں پہنچی، یا پہنچی تو مگر قابلِ لحاظ طریقے سے نہیں پہنچی، اور اس لئے وہ اس کی رسالت پر ایمان نہیں لاتا بلکہ اس کا انکار اور "کفر" کرتا ہے، تو اسے یقیناً اس معاملے میں معذور سمجھا جائے گا، بخلاف عقیدۂ توحید کے کہ اس کا منکر کسی حال میں بھی معاف نہیں کیا جائے گا، کیونکہ توحید کا تصوّر انسان کی فطرت میں از خود رچا بسا ہے، اور اس کی کھلی ہوئی نشانیاں ہر نظر کے سامنے اور ہر جگہ موجود ہیں، اس لئے اس بدیہی حقیقت کے انکار میں انسان ہرگز معذور نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کفر کی بعض شکلیں ایسی ہوں جو شدید ترین سزا کی موجب ہوں، اور نہ صرف آخرت ہی ہیں، بلکہ اس دنیا کی زندگی میں بھی، جو جزا کی نہیں بلکہ صرف عمل کی جگہ ہے، انسان کو بدترین انجام کا مستحق بنا دیں، چنانچہ قرآن کا بیان ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے، اور دنیا

بیسیوں بار اس کا ثبوت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔ اس قسم کے کفر کی واضح ترین مثال ان لوگوں کا کفر ہے جن کو ایمان کی دعوت براہ راست۔ انبیاء کرامؑ کے ذریعہ ملی تھی، جس کی وجہ سے ان کے سامنے حق کی وضاحت اور حجت کے اتمام میں نام کی بھی کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی، ایسے لوگوں کو جو کچھ آخرت کے روز پیش آئے گا وہ تو آنے ہی گا، اس دنیا کے اندر بھی انہیں ایسی سزا دی گئی کہ اُن کا تخم بھی باقی نہ رہ گیا۔ یا تو زلزلوں، طوفانوں، آتش فشانیوں، اور سنگباریوں کے عذاب نے انہیں چشم زدن میں نیست و نابود کر کے رکھ دیا، یا پھر اہلِ ایمان کی تلواروں سے ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی اور انہیں ذمّی کی حیثیت سے بھی زندہ رہنے کا حق نہیں دیا گیا جب کہ دوسرے اہلِ کفر کے لئے اس حق سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہمیشہ باقی رکھا گیا۔

شرک اور مُشرک

"شرک" کے لفظی معنی "ساجھا پن" کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں "شرک" کا مطلب یہ کہ کسی بھی غیرِ خدا کو خدا[۱] کی ذات میں، یا اس کی صفات[۲] میں، یا ان صفات[۳] کے لوازم میں شریک ٹھیرا دیا جائے۔

خدا کی ذات میں شریک ٹھیرانے کی چند شکلیں ہیں:۔

(۱) اس کے وجود کو کسی اور کے وجود سے، یا کسی اور کے وجود کو اس کے وجود سے قرار دینا، یعنی اس کے متعلق اتحاد یا حلول کا عقیدہ رکھنا۔

(۲) کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا۔

(۳) کسی کو اس کا باپ یا بیٹا قرار دینا۔

خدا کی صفات میں شریک ٹھیرانے کا مطلب یہ ہے کہ ان صفات میں سے کسی صفت کو کسی اور ہستی کے اندر بھی موجود مان لیا جائے، اور اسی مخصوص معنی میں موجود مان لیا جائے، جس معنی میں وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔

لوازمِ[۳] صفات میں شریک ٹھیرانے کا مطلب ہے کہ ان صفات کے فطری نتیجے میں جو اختیارات اور حقوق اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ثابت ہوتے ہیں، ان میں سے کسی اختیار یا حق کا کسی اور کو بھی

مالک مان لیا جانے۔ مثلاً خدا کی ایک صفت یہ ہے کہ حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا سارا اختیار اسی کو ہے، اس صفت کا ایک لازمی تقاضا تو یہ ہے کہ قسمتوں کے بنانے بگاڑنے کا اختیار اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور دوسرا یہ کہ التجائیں، فریادیں اور دعائیں پیش کئے جانے کا حق اُسی کو حاصل ہے اب اگر کوئی شخص مصیبت پڑنے پر کسی اور کو پکارتا ہے، یا اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی التجائیں کسی اور کے سامنے پیش کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ خاص کے لوازم میں شریک ٹھہرانا ہوگا۔

جو شخص اس طرح کے عقائد رکھتا ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات میں یا اس کی صفات میں، یا ان صفات کے لوازم میں کسی غیرِ خدا کو شریک اور حصہ دار ٹھیراتا ہو وہ قرآن کی زبان میں "مشرک" کہلاتا ہے۔

شرک کو قرآن نے "ظلمِ عظیم" یعنی اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑی حق تلفی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی معافی ہرگز نہ ہوگی۔

اہلِ کتاب

'اہلِ کتاب' کے لفظی معنی 'کتاب والوں' کے ہیں۔ مگر قرآن کی اصطلاح میں جس طرح لفظ 'کتاب' کا ایک خاص اور محدود و متعین مفہوم ہے اور اس سے مراد صرف کتابِ الٰہی ہوا کرتی ہے، نہ کہ مطلق کتاب، اسی طرح 'اہلِ کتاب' کا بھی ایک خاص اور متعین مفہوم ہے اور اس سے مُراد صرف یہودی اور عیسائی ہوا کرتے ہیں، نہ کہ ساری ہی مذہبی کتابوں کی ماننے والی ملتیں اور جماعتیں۔ یہ صحیح ہے کہ جب 'کتاب' سے مُراد 'کتابِ الٰہی' ہوتی ہے تو 'اہلِ کتاب' کا مفہوم بھی کتابِ الٰہی کے ماننے والے ہوں گے، اور اس کا اطلاق کچھ خاص کتابوں کے ماننے والوں تک محدود ہونے کے بجائے ساری ہی آسمانی کتابوں کے ماننے والوں تک وسیع ہونا چاہیئے لیکن جہاں یہ بات صحیح ہے، وہیں یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنی مذہبی کتابیں پائی جاتی ہیں ان میں سے صرف تین ہی کتابیں ایسی ہیں جن کے کتابِ الٰہی ہونے کی قرآن نے تصدیق فرما رکھی ہے:۔ توراتؑ، انجیلؑ۔ زبورؑ۔ اس لئے وہ جب 'اہلِ کتاب' کا لفظ استعمال

کرے گا تو اس سے اس کی مُراد قدرتی طور پر صرف اِنہی تین کتابوں کی پیرو مِلّتوں تک محدود ہوگی۔

توراتؔ کے نام پر وجود میں آنے والی مِلّت 'یہودی' ہیں، اور انجیلؔ کے ذریعہ ظہور میں آنے والی مِلّت 'عیسائی' ہیں۔ رہی زبوؔر تو اس کی بنیاد پر کوئی علیحدہ مِلّت وجود میں نہیں آئی، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کوئی مستقل کتاب ہے ہی نہیں اور اُس کی حیثیت بس تورات کے ضمیمہ کی سی ہے جو مشہور اسرائیلی پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور جسے یہودی اور عیسائی دونوں ہی گروہ مانتے ہیں۔

ان تین کتابوں کے سوا باقی جن کتابوں کو بھی آج آسمانی کتاب کی حیثیت سے مانا جا رہا ہے، چونکہ ان کے ذکر سے قرآن بالکل خاموش ہے اسلئے اُس کی سَند اور تصدیق کی بنا پر ان میں سے کسی کو کتابِ الٰہی، اور اس کے پیروؤں کو 'اہلِ کتاب' کہے جانے کی کوئی گنجائش نہیں، البتہ قیاس کا دروازہ ضرور کھُلا ہوا ہے۔ مگر ظاہر ہے، قیاس صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، اس لئے اسے قرآنی اعتراف و تصدیق کا قائم مقام کسی طرح نہیں قرار دیا جا سکتا، حالانکہ یہاں بحث ایک قرآنی اصطلاح کے مفہوم و مدّعا کی، دوسرے لفظوں میں قرآنی اعتراف و تصدیق ہی کی ہے۔

غرض 'اہلِ کتاب' کی اصطلاح یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے علم کی حیثیت رکھتی ہے، اور کسی تیسرے گروہ کو اُس کے دائرہ میں داخل نہیں سمجھا جا سکتا۔
